www.iqbalkalmati.blogspot.com

جال

جیمز گولڈ سمتھ

ترجمہ: الطاف احمد قریشی

دنیا بھر میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری'
تشدد کے رجحان میں اضافہ ' غربت و افلاس کا کستا ہوا شکنجہ
اور ماحول کی آلودگی جیسے سنگین مسائل ' بکھرتے ہوئے
عائلی معاشرہ کی چند نشانیاں ہیں۔ اس سے بھی زیادہ ہولناک.....

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جال

جیمز گولڈ سمتھ

ترجمہ: الطاف احمد قریشی

مشعل

آر- بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور54600 ' پاکستان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فہرست

پیش لفظ	۵
حرف تشکر	۱۵
دیباچہ	۱۶
باب 1	۱۷
ناپ تول یا فہم و ادراک	
باب 2 نیا یوٹوپیا	۲۴
باب 3	۴۶
اقوام مصنوعی ریاستیں اور گنجان آباد مقامات	
باب 4	۶۸
فلاحی ریاست کے تصور پر نظر ثانی	
باب 5	۷۷
جدید زراعت اور معاشرے کی تباہی	
باب 6	۹۸
ایٹمی توانائی بہت بڑا جھوٹ	
باب 7	۱۱۹
کیوں؟	

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیش لفظ

جال (The Trap) ترقی یافتہ مغرب کے لیے وسیع تر تحقیق پر مبنی ایک انتباہ ہے۔ کتاب میں جیمز گولڈ سمتھ مغرب میں مروجہ افکار و نظریات یکسر مسترد کرتے ہوئے انہیں مختلف سیاسی معاشی اور معاشرتی مسائل کا موجب قرار دیتا ہے۔ یہ مجموعہ انکشافات قاری کو مغرب کی تیز رفتار ترقی کے پس پردہ جاری تنزل کے عمل سے آگاہ کرتا ہے۔

اس کتاب میں جیمز گولڈ سمتھ عالمی آزادانہ تجارت، جدید زراعت اور جوہری توانائی کے پرامن استعمال کو مغربی معاشرہ کے استحکام کے لئے مہلک قرار دیتا ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا نقطہ نظر ان خیالات کے بارے میں مختصراً بیان کر دیا جائے تاکہ قاری ابواب کا مطالعہ کر کے اصل حقیقت کی تہہ تک پہنچ سکے۔ مزید برآں قاری کو ان خیالات کے پس پردہ عوامل اور پاکستان جیسے ملک پر ان اثرات سے آگاہ کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اقتصادی میدان میں جیمز گولڈ سمتھ نے اعداد و شمار کے کھیل کو حقیقی معاشی ترقی کا معیار ماننے سے انکار کیا ہے۔ مصنف مجموعی قومی پیداوار (GNP) کو خوشحالی اور فلاح و بہبود کا پیمانہ قرار نہیں دیتا۔ معاشی ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لئے قومی پیداوار میں اضافہ ناگزیر ہے لیکن یہ ترقی بہت حد تک سماجی استحکام کی قیمت پر حاصل کی جاتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں آمدنیوں میں تفاوت پیدا ہو جاتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ نتیجتاً معاشی ترقی کے ثمرات کی غیر منصفانہ تقسیم معرض وجود میں آتی ہے۔ غیر منصفانہ تقسیم دولت ترقی پذیر ممالک میں مختلف نوع کے سماجی و سیاسی مسائل کو جنم دیتی ہے جو بالآخر سیاسی استحکام پر منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس مشاہدہ کا اطلاق پاکستان کے معاشرہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر بدرجہ اتم کیا جا سکتا ہے۔ معاشی افزائش کی شرح بڑھنے سے آمدنیوں میں تفاوت بڑھنے لگتا ہے جو سماجی بے اطمینانی میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک اس رجحان کا شکار ہیں۔ پاکستان کا ساتواں پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ اس حقیقت کو بہ بانگ دہل تسلیم کرتا ہے۔ معاشی ترقی کی رفتار تیز ہونے کے ساتھ مختلف قسم کے مسائل ترقی پذیر ممالک کو اپنی گرفت میں لے کر دبوچنا شروع کر دیتے ہیں۔ معاشی ترقی ان ممالک کے لئے پریشان کن حالات پیدا کر دیتی ہے۔ لہٰذا جی این پی (GNP) معاشی ترقی کو ناپنے کا قابل اعتبار معیار گردانا نہیں جا سکتا۔ لیکن کسی اور معیار کی عدم دستیابی میں معیشت دان اسے معاشی ترقی کو جانچنے کا معیار تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ آیئے دیکھیں جیمز گولڈ سمتھ اس ضمن میں کیا کہتا ہے:

> ''ہم قوموں کی ترقی کو ان کی مجموعی قومی پیداوار کی بنیاد پر ناپتے ہیں۔ اس لیے ہم غلط نتائج حاصل کرتے ہیں اور یہ ایسی غلطیاں ہیں جان کے نتائج بڑے المناک ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ ہم مجموعی قومی پیداوار میں تیز رفتار ترقی حاصل کرنے والے معاشرہ کو دنیا بھر کے معاشروں میں نمونے کے طور پر پیش کریں۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ یہ ترقی سماجی استحکام کی قیمت پر حاصل کی گئی ہے۔ مغرب نے اسی طرح دنیا کو عدم استحکام کا شکار کیا ہے۔ ہم نے خود کو قائل کر لیا ہے کہ دنیا میں صرف ایک ہی اقتصادی اور سماجی نمونہ ہے اور وہ ہمارا ہے۔ اسے پوری دنیا پر نافذ کرنے کے لئے ہم نے دنیا کے تقریباً ہر کونے میں اپنی بیماریاں پہنچائی ہیں۔ جرم، منشیات، شراب، خاندانی توڑ پھوڑ، شہروں کے پسماندہ علاقوں میں شہری بدنظمی، تیز رفتار ماحولیاتی آلودگی اور اسی قسم کے دوسرے مسائل جن کا ہم روزانہ سامنا کرتے ہیں وہ بیماریاں جو ہم نے دنیا کے کونے کونے تک پہنچائی ہیں۔ ہم ان بیماریوں کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ ہم دنیا کو یہ بتانے سے نہیں جھجکتے کہ سب کچھ صحت مند اقتصادی ترقی اور خوشحالی لازمہ ہیں......

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اقتصادی ترقی صرف اسی وقت تک سود مند ہوتی ہے جب تک وہ
معاشرہ کی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔"

جیمز گولڈ سمتھ کا تجزیہ معاشی ترقی کے بارے میں حقیقت پر مبنی نظر آتا ہے۔ آج کل دنیا میں جی این پی (GNP) کو طنزاً (Gross National Pollution) مجموعی قومی آلودگی کہا جاتا ہے۔ جی این پی بڑھاتے بڑھاتے ماحولیاتی آلودگی میں اضافہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جیمز گولڈ سمتھ کا یہ نظریہ بھی بڑا وزنی ہے کہ اقتصادی ترقی کا مقصد ایک معاشرہ کی بنیادی معاشی، سماجی ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ اس نظریہ کی گونج ترقی پذیر ملکوں میں اکثر سنائی دیتی ہے۔ وقت کا المیہ یہ ہے کہ اقتصادی ترقی کے باوجود تیسری دنیا کے ممالک میں بنیادی زندگی کی ضرورت کہیں پوری ہوتی نظر نہیں آتیں۔ پاکستان بھی ان ملکوں کی صف میں شامل ہے۔

جیمز گولڈ سمتھ کتاب کے دوسرے باب میں بین الاقوامی آزاد تجارت اور Gatt کی مخالفت کرتا ہے اور انہیں صنعتی دنیا کو کنگال اور غیر مستحکم کرنے کا باعث قرار دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ بین الاقوامی تجارت کا نسبتی فوقیت کا اصول (Theory of Comparitive Advantage) بیان کر کے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ترقی یافتہ مغربی ممالک کے لئے یہ قطعی طور پر سود مند نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ چین، بھارت، ویت نام، بنگلہ دیش اور سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد الگ ہونے والے ممالک میں بیروزگاری کی شرح بہت زیادہ ہے، لہٰذا بے روزگاری کی وجہ سے ان ممالک میں اجرت کی شرح بہت کم ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی مصنوعات ان ممالک کی مصنوعات سے لاگت کی بنا پر مقابلہ نہیں کر سکیں گی۔ بہ الفاظ دیگر اجرت کی سطح میں نمایاں فرق ترقی پذیر ممالک میں کل پیدائش مصارف میں کمی کا باعث بنے گا۔ جیمز گولڈ سمتھ کے الفاظ میں "ایسی اقتصادی پالیسی کو اپنانا یقیناً ایک فاش غلطی ہوگی جو آپ کو اپنے ملک کی لیبر فورس ختم کر کے پیداوار کو دوسرے ممالک میں منتقل کر کے امیر کبیر بنا دے۔ ایسی اقتصادی پالیسی کس کام کی جس کے تحت اگر آپ اپنے لوگوں کو روزگار مہیا کریں تو اس سے آپ دیوالیہ ہو جائیں۔" گولڈ سمتھ کے نزدیک تجارت میں توازن حاصل کرنے کے لئے مغربی ممالک کو ایسی مصنوعات تیار کرنا ہوں گی جن میں کم محنت خرچ ہو لیکن اس سے مصنف کی دو باتوں کا خدشہ ہے، پہلے تو یہ کہ ایسی مصنوعات کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

برآمد سے ٹیکنالوجی کی منتقلی نہیں رک سکے گی اور اس طرح مغرب کی اجارہ داری خطرہ میں پڑ جائے گی۔ وہ جنوبی کوریا اور فرانس کے درمیان تیز رفتار ٹرینوں کے معاہدے کی مثال دیتے ہوئے کہتا ہے:

"جنوبی کوریا کو ٹیکنالوجی منتقل کرنے کے بعد یہ ہوگا کہ چند برسوں کے دوران ایشیا تیز ترین ٹرینیں فرانس کو نظر انداز کرکے براہ راست جنوبی کوریا سے خریدنے کے قابل ہو جائے گا"

دوسری طرف وہ یوں رقم طراز ہے، "ہماری تجارت مالیاتی معنوں میں تو متوازن ہوگی لیکن اگر ہم مالیاتی اعداد وشمار سے آگے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ روزگار کے معنوں میں انتہائی خوفناک عدم توازن ہوگا"

یہاں اس کے دونوں خدشات بے معنی نظر آتے ہیں کیونکہ ٹیکنالوجی کی منتقلی ہونے کے باوجود ترقی پذیر ممالک میں تیار ہونے والی مصنوعات کوالٹی کے اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک کی مصنوعات سے مقابلہ نہ کر پائیں گی۔ دوسرے یہ کہ سائنس کی تیز رفتار ترقی سے ٹیکنالوجی میں سرعت سے تبدیلیاں آنے کی وجہ سے ترقی یافتہ ممالک کا پلہ ہمیشہ بھاری رہے گا۔ فی زمانہ اقتصادی مقاصد ہی سیاسی مقاصد کو شکل دیتے ہیں اور ٹیکنالوجی کی منتقلی میں سیاسی مقاصد کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس لئے ٹیکنالوجی کی منتقلی سے مغرب کو جو دوسرے بڑے مفادات حاصل ہوں گے ان کو جیمز گولڈسمتھ نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ مزید برآں ٹیکنالوجی کی منتقلی کا مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اول معاشی مفادات کے پیش نظر مغرب اپنی ٹیکنالوجی تیسری دنیا کے ممالک کو منتقل کرنے پر راضی نہیں ہے۔ دوسرے، تیسری دنیا کے ممالک میں ریسرچ اینڈ ڈیویلپمنٹ (R&D) کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مغربی ٹیکنالوجی میں جب تک مناسب تبدیلیاں نہ لائی جائیں اسے ان ملکوں کی ضروریات کے تابع نہیں کیا جا سکتا۔

اس سلسلہ میں یہ بات بڑی اہم ہے کہ جنوبی کوریا، ہانگ کانگ اور سنگاپور جیسے ممالک کو چھوڑ کر تیسری دنیا میں اور کتنے ممالک ہیں جو کسی بھی جدید ٹیکنالوجی کو فوراً اختیار کر سکتے ہیں۔ تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک ایک لمبے عرصہ تک مغربی ماہرین پر انحصار کریں گے اور جب تک وہاں کے باشندے اس سے متعلق پوری واقفیت حاصل نہیں کر لیتے، اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عرصہ میں نئی ٹیکنالوجی ایجاد ہو چکی ہوگی اور یہ تبدیلی کا عمل چلتا رہے گا۔ ٹیکنالوجی رخنہ (GAP) بدستور ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان قائم رہے گا۔

جہاں تک بے روزگاری کا سوال ہے تو اب زمانہ بدل چکا ہے۔ پہلے ترقی پذیر ممالک کے لوگ ترقی یافتہ ممالک میں روزگار کی تلاش میں جایا کرتے تھے۔ اب حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک میں روزگار پر نہایت شدید قسم کی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ بہت سی بین الاقوامی کمپنیاں اپنے ماہرین ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ وہ عام مزدوروں کے لئے تو اسی ملک کے باشندوں کو رکھتی ہیں تاکہ ان کی مصنوعات کی لاگت کم ہو، مگر اہم ذمہ دارانہ عہدوں پر وہ اپنے ہی آدمی رکھتی ہیں جیسا کہ خلیجی جنگ کے بعد عرب ممالک میں ہو رہا ہے۔ مزید برآں ٹیکنالوجی کے موجد اپنا کام جاری رکھتے ہیں اور لوگ ان تحقیقی اداروں میں کام کرتے رہتے ہیں اور بے روزگار نہیں ہوتے۔ کئی طریقوں سے بین الاقوامی کمپنیاں اتنا منافع کما کر اپنے ملکوں میں منتقل کر دیتی ہیں جس سے روزگار کے مواقع پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اصل مسئلہ تو تیسری دنیا کے پسماندہ اور غریب ممالک کا ہے جن میں عوام کے لئے سب سے بڑا مسئلہ دووقت کی روٹی ہے۔

ان سب باتوں سے جیمز گولڈ سمتھ کے متعصّبانہ رویہ کے سوا کچھ اور ظاہر نہیں ہوتا اور اس سوچ کا انداز ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (WTO) کے بارے میں اس کے بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ان مسائل کے حل کے لئے وہ علاقائی آزادانہ تجارت پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے:

> ''ہمیں آزادانہ عالمی تجرات کے نظریہ کو مسترد کرنے سے آغاز کرنا چاہئے اور آزاد علاقائی تجارت کو اس کے متبادل کے طور پر آگے بڑھنا چاہئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی علاقہ باقی دنیا کے ساتھ تجارت نہیں کر سکے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر علاقہ یہ فیصلہ کرنے میں آزاد ہوگا کہ وہ دوسرے علاقوں کے ساتھ دوطرفہ معاہدہ کرے یا نہ کرے۔''

دوسرے وہ خصوصی مہارت کو یکسر مسترد کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''چند شعبوں میں خصوصی مہارت حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باقی شعبوں کو چھوڑ دیا جائے۔ حالانکہ صرف رنگا رنگ یا مختلف النوع معیشت ہی روزگار فراہم کرتی ہے جس سے لوگ معاشرہ میں اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔“

جہاں تک آزادانہ علاقائی تجارت کا تعلق ہے تو اب تک یہ خیال تمام محاذوں پر ناکام رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ قومیت پرستی کا بڑھتا ہوا رجحان ہے۔ مزید برآں مختلف علاقائی تنظیموں کے ممالک کے درمیان اختلافات اتنے گہرے ہیں کہ ان کو ختم کرنے کے لئے ایک زمانہ چاہیے۔ مثال کے طور پر تمام یورپین دوسری جنگ عظیم کی تلخ یادیں اپنے سینوں میں محفوظ کئے ہوئے ہیں اور آج بھی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ECO کو لے لیجئے جو مذہبی، معاشی اور معاشرتی تفریق کے باعث کانفرنس ہال سے باہر نہیں آ سکی اور (Nafta) (North Atlantic Free Trde Area) میں رہتے ہوئے بھی میکسیکو کی معیشت اس طریقے سے بحران سے دوچار ہوئی کہ پاکستان کی سٹاک ایکسچینج متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

جہاں تک خصوصی مہارت کا سوال ہے تو اس بات کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ یہ صرف خصوصی مہارت ہی ہے جس نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو یہاں تک پہنچایا ہے اور انسان کو مختلف مسائل سے نجات دلائی ہے۔ اس لئے انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر خصوصی مہارت ایک ضروری امر ہے۔ خصوصی مہارت کی بنا پر ہی ترقی یافتہ ممالک نے ترقی پذیر ممالک پر فوقیت بین الاقوامی تجارت کے شعبہ میں حاصل کی ہے۔ ترقی پذیر ممالک نے جن میں پاکستان بھی شامل ہے، زرعی خام اشیاء میں تخصیص حاصل کر کے تجارتی توازن اپنے خلاف کر لیا ہے۔

تیسرے باب میں جیمز گولڈ سمتھ نے کسی بھی معاشرے میں تہذیب و تمدن کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور اسے کسی بھی قوم کا جزو کامل قرار دیا ہے اور جہاں کہیں بھی ریاستیں کسی مشترک ثقافت کے بغیر تشکیل دی گئی ہیں انہیں جیمز گولڈ سمتھ ”مصنوعی ریاستیں“ قرار دیتا ہے۔

اس کے خیال میں صرف تہذیب و ثقافت ہی ہے جو کسی بھی حقیقی ریاست کو مصنوعی ریاست سے الگ کرتی ہے اور جو قوم اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت کو بھول جاتی ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ مصنوعی ریاست بن جاتی ہے اور اپنے منطقی انجام سے نہیں بچ سکتی۔

ہم نے پاکستان کو اسلامی تشخص کی بنیاد پر حاصل کیا تھا۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہماری تہذیب وتمدن کے سوتے اسلامی نظریات و افکار سے پھوٹتے ہیں اور بحثیت قوم ہمیں ایک الگ خطہ چاہئے جہاں پر ہم ان نظریات کو بنیاد بنا کر اپنی زندگیاں گزار سکیں۔ لیکن صد افسوس کہ ہم ایسے معاشرہ کی تشکیل کرنے میں ناکام ہوگئے ہیں جس کی بنیاد سماجی انصاف پر ہو۔ چونکہ ایسا معاشرہ وجود میں نہیں آ سکا ہے۔ اس لئے پاکستان بھی ایک مصنوعی ریاست بنتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم طرح طرح کے لسانی، صوبائی اور فروعی مسائل کا شکار ہیں۔ تہذیب و ثقافت کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ ماسٹرچ معاہدے کی بنیاد پر یورپین کمیونٹی کو مسترد کرتا ہے۔ شراکتی جمہوریت کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''جمہوریت اسی صوبہ میں صحیح طور پر کام کرتی ہے جب اس میں لوگوں کی شرکت ہو۔ صحت مند جمہوریت میں عوام ہی یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ان کے رہنماؤں کے پاس کون سے اختیارات ہونے چاہئیں۔ جھوٹی جمہوریت میں رہنما فیصلہ کرتے ہیں کہ عوام کو کون سی آزادیاں دی جانی چاہئیں''

وہ کہتا ہے:

> ''مزید برآں جمہوریت کو نمائندہ بلکہ شراکتی ہونا چاہئے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ شہریوں کو ایسے معاملات پر فیصلہ دینے کا اپنے پاس اختیار رکھنا چاہیے جو ان کے معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں''

یہاں پر ہمارے لئے سوچنے کا مقام ہے۔ ہمارے ہاں جمہوریت صرف جھوٹے انتخابی نعروں اور نام نہاد الیکشن کا نام ہے۔ انتخابات کے بعد عوام مکمل طور پر ان نمائندوں کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔ نمائندے غریب عوام کو بھول کر اپنے ذاتی مفادات بڑھانے کی دوڑ میں لگ جاتے ہیں۔ بیشتر نمائندوں کا تعلق جاگیردار گھرانوں سے ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ کسی صورت میں غریب عوام کی اسمبلیوں میں نمائندگی کرنے سے قاصر ہیں۔ کبوتر کی نمائندگی بلی کسی صورت میں نہیں کر سکتی، لہٰذا جمہوری نظام میں تبدیلیوں کی ضرورت ہے جس کے تحت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غریب عوام کی نمائندگی ان کے اپنے نمائندے جن کا تعلق غریب کلاس سے ہو، کر سکتے ہیں۔

گولڈسمتھ اس قسم کی فلاحی ریاست کے خلاف ہے جس میں ساری ذمہ داری حکومت کو ہی اٹھانا پڑتی ہے۔ اسی لئے وہ کہتا ہے:

> ''ہر وہ کام خاندان کے سپرد کر دینا چاہئے جو خاندان کی سطح پر ہو سکتا ہے۔ ہر وہ کام جو مقامی، سماجی یا مذہبی گروہوں کے ذریعہ ہو سکتا ہے اسے انہیں کے سپرد کر دینا چاہئے۔ علاقہ کا کام جو وہ کر سکتا ہے اس کے حوالہ کر دینا چاہئے''

یہاں پر ہمیں اپنے بلدیاتی نظام اور صوبائی خود مختاری کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے۔ اس طریقہ سے اگر بہت سے مسائل کو نچلی سطح پر ہی حل کر لیا جائے تو عوام کو بھی سہولت ہو گی اور ساتھ ہی ساتھ مرکز بھی قومی سطح کے مسائل پر پوری توجہ دے سکے گا۔

تعلیم کے بارے میں جیمز گولڈسمتھ کا کہنا ہے:

> ''سکول بہت سی قسموں کے ہونے چاہئیں۔ وہ سکول جنہیں ریاست چلائے، میونسپلٹی چلائے، کل کمیونٹی چلائے، فلاحی ادارے چلائیں، ٹیچرز کوآپریٹوز چلائیں، والدین کے کوآپریٹوز اور نجی ادارے چلائیں۔ اس سے والدین کو انتخاب کا موقع ملے گا۔ نتیجتاً جیسا کہ آزاد منڈی کا معمول ہے۔ جو سکول عوام کو مطمئن کر پائیں گے ان میں توسیع ہو گی اور جو عوام کو مطمئن نہیں کر سکیں گے وہ یا تو اپنی اصلاح کریں گے یا ختم ہو جائیں گے''۔

ہمارے لئے یہ سبق ہے کہ ریاست پر تمام ذمہ داری ڈالنے کی بجائے ہمیں اپنے طور پر سکول کھولنے چاہئیں، کیونکہ ہمارے جیسا غریب ملک ریاستی بنیادوں پر تمام بچوں کے لئے سکول فراہم نہیں کر سکتا۔ لہٰذا NGOs اس سلسلہ میں ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ تعلیمی ٹرسٹ قسم کے ادارے تعلیم کے فروغ میں بڑی خدمت کر سکتے ہیں۔ خواندگی کی شرح بڑھانے کی سلسلہ میں ہمیں ایسے اداروں پر انحصار کرنا ہو گا۔ اس وقت ملک میں دو تعلیمی نظام رائج ہیں۔ ایک نظام کے تحت امراء کے بچوں کی تعلیم کے لئے مخصوص قسم کے تعلیمی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ادارے موجود ہیں جہاں بچوں کو معاشرتی، طبعی علوم میں انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے اور لاشعوری طور پر مغرب کی مادی اقدار کو بچوں کے ذہن میں گاڑا جاتا ہے۔ وہ مغربی کلچر کو زندگی میں اپنا کر عوام الناس کے مقابلہ میں اپنے آپ کو برتر تصور کرنے لگتے ہیں۔ دوسرا نظام عام بچوں کے لئے ہے۔ گورنمنٹ کی تحویل میں تعلیمی اداروں کو دیکھ بھال بھی ممکن نہیں ہو پاتی۔ لہٰذا عوام کے بچے جو اس نظام کے تحت تعلیم حاصل کرتے ہیں لاشعوری طور پر ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دو طبقاتی تعلیمی نظام قومی کلچر کی یک جہتی کے پنپنے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ لہٰذا اگر ہم اپنے معاشرہ سے طبقاتی تفریق کو کم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں تمام تعلیمی اداروں میں یکساں تعلیمی نصاب اور ذریعہ تعلیم رائج کرنا ہوگا۔ بصورت دیگر طبقاتی کشمکش ہمارے درمیان بڑھاتی رہے گی۔

جیمز گولڈ سمتھ نے جدید زراعت کو دیہی علاقوں میں بے روزگاری، شہروں کے بڑھتے ہوئے مسائل اور ماحولیاتی آلودگی کا سبب قرار دیا ہے۔ اس کے خیال میں جدید زراعت دیہی علاقوں میں بے روزگاری کا سبب بنتی ہے اور دیہی آبادی کی شہروں میں منتقلی شہروں کے لئے بڑے مسائل پیدا کرتی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان جیسا ملک اس سے کیسے بچ سکتا ہے۔ اگر ہم جدید طریقہ زراعت کو نہیں اپناتے تو کیا ہم سرپلس (Surplus) زرعی پیداوار کو بڑھانے میں کامیاب ہوسکیں گے، جس کی اس وقت اشد ضرورت ہے؟ سو ہماری بقا اور ترقی جدید زراعت کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ درست منصوبہ بندی کے تحت دیہی علاقوں میں صنعت سازی ہمارے بہت سے معاشرتی و معاشی مسائل حل کرسکتی ہے۔ اب تک صنعت سازی شہری علاقوں میں ہوئی ہے اور دیہی علاقے اس کی زد سے باہر رہے ہیں۔ ہمیں موجودہ رجحان کو تبدیل کرنا ہوگا۔ دیہی علاقوں میں صنعت سازی کی وجہ سے معاشی، معاشرتی سہولتیں پیدا ہونا شروع ہو جائیں گی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دیہی علاقوں سے آبادی کی شہروں میں منتقلی کم ہونا شروع ہو جائے گی۔ دیہی علاقوں، شہری علاقوں میں سماجی، معاشرتی سہولتوں میں تفاوت دور کرنے سے منتقلی کا رجحان بہت کم ہو جائے گا۔

اس کتاب کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یقیناً جیمز گولڈ سمتھ کا نقطہ نظر جانبدارانہ نظر آتا ہے کیونکہ اس نے تقریباً معاشی و معاشرتی مسائل کا احاطہ کیا ہے جو مغرب کو درپیش ہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکن اس کتاب میں ہمارے لئے سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ مغرب کی اندھا دھند تقلید ہمارے حق میں نہیں ہے اور ہمارے منصوبہ سازوں کو ہماری معاشرتی اور معاشی ضروریات سامنے رکھتے ہوئے منصوبہ بندی کرنا ہوگی، تاکہ ہم اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کو اس ٹریپ سے بچا سکیں جس میں ہم پھنستے جا رہے ہیں۔

پروفیسر منظور مرزا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حرف تشکر

اس کتاب کے لئے میرے جن دوستوں نے مجھے اپنے مشوروں سے نوازا اور تحقیقی کام میں میری مدد کی، میں ان کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ان میں جیفری برمین، سٹیوراٹ بوائل، جیکس بروییل، جون کریک نیل، مائیکل کرافورڈ، سٹیفن ڈیلر، برونوار، ہارڈچ سئیز، چارلس فلمر، جان گرے، نکولس ہلڈ یارڈ، الیگرا ہوسٹن، روبن جینکنز، رچرڈلیسی، اموری لوونز، کلاں ہینری لیکونٹ، ژاں مونا، جرمی رفکن، لوریٹا رکوا نووا، مائیکل شنیڈر، جیمز تھرودر، کلیسَ ٹروکے، لوری ویلاش، کارن ویسٹ اور برجٹ ووڈ مین شامل ہیں۔

جیمز گولڈسمتھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیباچہ

میں نے اکتوبر 1992ء میں سوبورن یونیورسٹی پیرس کے گرینڈ ایمفی تھیٹر میں جیمز گولڈ سمتھ کو لیکچر دیتے ہوئے سنا۔ ان کے سامعین کی تعداد دو ہزار سے زائد تھی جن کی اکثریت یورپ کے پوسٹ گریجویٹ طلبہ پر مشتمل تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ کتاب لکھی جانی چاہئے۔ میں نے اس لیکچر کے دوران بحث مباحثہ اور نوک جھونک نہیں کی بلکہ میں نے تبدیلی کے ایجنٹ کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے سوچا کہ سوبورن میں گولڈ سمتھ نے جن خیالات کا اظہار کیا، انہیں ریکارڈ کر لینا سود مند ہوگا چنانچہ یہی میں نے کیا ہے۔

ایوز میسارووچ

(Yves Messarovitch)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب 1

ناپ تول یا فہم و ادراک

''ہم واضح طور پر ان دشواریوں کی وجہ سے مشکل میں گھرے ہوئے ہیں جن کا سامنا جدید معاشرے کو ہے۔''

جدید دنیا کا ہر معاشرہ ایسے سنگین مسائل سے دو چار ہے۔ جن کے آسان اور عمومی حل موجود نہیں ہیں لیکن بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کی بنیاد ایک ہی ہے۔ جدید معاشرے، سائنس، ٹیکنالوجی اور معیشت کو ایسے اہم وسیلوں کے طور پر نہیں دیکھتے جن کے ذریعے خوشحالی اور انسانی بہتری کو فروغ دیا جا سکتا ہے، بلکہ ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں جیسے یہ وسائل خود ہی سب کچھ ہوں۔ سائنسی علم میں اضافہ، نئی ٹیکنالوجی کے فروغ اور اقتصادی ترقی و افزائش کا پیچھا اس طرح کیا جاتا ہے جیسے یہی انسانی کوشش کے مقاصد ہوں اور ان کا مقصد انسانی بہتری نہ ہو۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے سماجی استحکام اور بعض اوقات پوری ثقافت کو قربان کر دیا جاتا ہے۔ میرا یہ یقین ہے کہ روایات کی یہی الٹ پلٹ ہماری بہت سی خرابیوں کی جڑ ہے۔

''یعنی آپ اتفاق کرتے ہیں کہ اقتصادی ترقی اور خوشحالی فائدہ مند ہیں، اس کے باوجود آپ سماج پر ہونے والے ان کے اثرات پر شبہ کرتے ہیں۔''

یقیناً ہمارے جیسے صنعتی معاشروں کو اقتصادی خوشحالی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن مجھے یہ تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ محض اقتصادی افزائش ہی قوموں کی کامیابی کا اصل پیمانہ ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کو دیکھئے۔ جدید امریکہ نے جو عظیم الشان اقتصادی ترقی اور عظیم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ترین مادی خوشحالی حاصل کی ہے، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ گزشتہ پچاس برس کے دوراس کی مجموعی قومی پیداوار (جی این پی) کو، جو چوگنی ہوگئی، افراط زر کے پیش نظر ہی ترتیب دیا گیا۔ اس کے باوجود امریکی معاشرہ انتہائی خطرناک سماجی بحران کا شکار ہے۔

برطانیہ میں بھی گزشتہ پچاس برسوں کے دوران مادی خوشحالی کی زبردست لہر آئی۔ اس کی مجموعی قومی پیداوار حقیقی معنوں میں تگنی ہوئی۔ چنانچہ جدید پیمانہ کے مطابق ان دونوں قوموں نے اپنے عظیم ترین خوابوں سے بھی کہیں زیادہ کامیابیاں حاصل کیں۔ اس کے باوجود دونوں قومیں شدید مشکل میں مبتلا ہیں۔

''آپ کے خیال میں اس کی کیا وجوہات ہیں؟''

جدید کلچر کی ایک خرابی یہ ہے کہ ہمیں باور کرایا جاتا ہے کہ ہر مسئلہ کو اقتصادی نقطہ نظر سے جانچا جا سکتا ہے لیکن جب معاشرے کا اصلی وسیلہ فہم وادراک کی بجائے پیمائش ہو تو پھر بڑی بڑی غلطیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

خوشحالی کو جانچنے کے لئے جو سرکاری اشاریہ استعمال ہوتا ہے، وہ ہے مجموعی قومی پیداوار (جی این پی) لیکن مجموعی قومی پیداوار تو صرف حرکت یا چال کو ناپتی ہے۔ یہ نہ تو خوشحالی کو ناپتی ہے نہ ہی بہتری کو۔ مثال کے طور پر اگر سمندری طوفان یا زلزلے جیسی کوئی آسمانی آفت آتی ہے تو اس کا فوری نتیجہ مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ حرکت میں اضافہ ہوگا تاکہ نقصان کو پورا کیا جا سکے۔ اگر کوئی انتہائی موذی متعدی مرض کسی علاقے میں پھیلتا ہے تو نئے ہسپتالوں کی تعمیر اور پبلک ہیلتھ کے کارکنوں کے لئے روزگار کے مواقع پیدا ہونے کی وجہ سے مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ اگر جرائم کی شرح بڑھتی ہے تو مجموعی قومی پیداوار بڑھتی ہے۔ اس لئے کہ پولیس میں مزید بھرتی ہوئی اور نئے جیل خانے تعمیر کئے جائیں گے۔ ہم اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں۔ امریکہ میں کینسر پر خرچ کا تخمینہ 110 بلین ڈالر سالانہ ہے جو کہ مجموعی قومی پیداوار کا 1.7 فیصد ہے۔ منشیات پر خرچ کا تخمینہ 200 بلین ڈالر سالانہ یا مجموعی قومی پیداوار کا 3.1 فیصد ہے۔ اسی طرح جرائم پر اخراجات کا تخمینہ 163 بلین ڈالر سالانہ یا مجموعی قومی پیداوار کا 2.6 فیصد ہے۔ صرف یہ تین شعبے قوم کی مجموعی قومی پیداوار میں 473 بلین ڈالر یا مجموعی قومی پیداوار کا 7.4 فیصد کا اضافہ کرتے ہیں اور ان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ انتہائی مثالیں ہیں لیکن ان سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ظاہر ہوتا ہے کہ مجموعی قومی پیداوار کوئی معیاری پیائش نہیں ہے بلکہ محض حرکات کا پیمانہ ہے، چاہے وہ حرکت یا سرگرمی مثبت ہو یا منفی۔ اسی طرح ہمارے تمام سرکاری اعداد و شمار صرف ایک ہی مقصد یعنی مجموعی قومی پیداوار کی افزائش کی بنیاد پر تیار کئے جاتے ہیں اور سماجی ترقی کے لئے ہمارے تمام منصوبے اس کے تابع ہوتے ہیں۔

''مجموعی قومی پیداوار کے علم حساب پر انحصار کرنے سے اور کس قسم کے جھوٹے نتائج سامنے آتے ہیں؟''

ان نتائج کا کوئی شمار نہیں۔ دو ہمسایہ خاندانوں کی مثال لیجئے۔ دونوں خاندانوں کی ماؤں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا وقت بچوں اور گھر کی دیکھ بھال میں صرف کریں گی۔ اچانک ان میں سے ایک خاندان کی ماں اپنا خیال بدل لیتی ہے اور ملازمت کے لئے گھر سے باہر جاتی ہے۔ اپنے بچوں کی نگہداشت کے لئے وہ اپنی ہمسائی کو ملازم رکھ لیتی ہے۔ اس تبدیلی سے پہلے دونوں عورتوں میں سے کوئی بھی مجموعی قومی پیداوار میں اپنا حصہ نہیں ڈال رہی تھی۔ اس لئے کہ صرف اسی حرکت یا سرگرمی کو پیداواری عمل شمار کیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں پیسے کا لین دین ہو۔ جب دونوں عورتیں بغیر تنخواہ کے اپنے خاندانوں کی نگہداشت کر رہی تھیں تو وہ سرکاری معیشت میں یعنی مجموعی قومی پیداوار میں اپنا حصہ نہیں ڈال رہی تھیں۔ لیکن جونہی انہوں نے طرز زندگی بدلا اور تنخواہیں وصول کرنا شروع کر دیں تو مجموعی قومی پیداوار میں ان کا حصہ شامل ہونے لگا۔

آیئے دوسری مثال لیتے ہیں۔ اگر ایک کسان اپنے خاندان کی کفالت کے لیے بہت سی فصلیں اگاتا ہے تو اس کے نام کو مجموعی قومی پیداوار میں شامل نہیں کیا جاتا، اس لئے کہ وہ جو خوراک پیدا کرتا ہے، وہ فروخت کے لئے نہیں ہوتی۔ کوئی مالی لین دین نہیں ہوا۔ اگر وہ بہت سی فصلیں اگانا چھوڑ دے اور صرف ایک فصل پر توجہ دے تو پھر ہر چیز تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی پیداوار کو مارکیٹ میں بیچنا شروع کر دیتا ہے اور اپنے خاندان کی کفالت کے لئے وہ خوراک خریدتا ہے جو دوسرے کسان پیدا کرتے ہیں۔ خریدنے اور بیچنے کی وجہ سے وہ سرکاری معیشت کا حصہ بن گیا ہے۔ بلاشبہ اس نے جو خوراک پیدا کی، مجموعی قومی پیداوار میں اس کی قدر کا تعین ایک سے زیادہ مرتبہ ہوگا اور اس کا انحصار اس پر ہے کہ اس خوراک کے صارفین تک پہنچنے سے پہلے وہ کتنے آڑھتیوں کے پاس فروخت ہوگی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مجموعی قومی پیداوار صرف رسمی معیشت میں ہونے والی سرگرمیوں کی پیمائش کرتی ہے، جس سے مالیاتی کاروبار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے اقتصادی پیداوار کو محض غیر رسمی معیشت کی قیمت متعین کر کے اور اسے سرکاری معیشت میں شامل کر کے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب غیر رسمی معیشت کو تباہ کرنا ہے۔ اس لئے کہ یہ اسے اس روائتی ڈھانچے سے الگ کر دیتی ہے جس کا وہ لازمی حصہ ہے۔ چنانچہ اسی سے خاندانی رشتوں اور مقامی جمہوری اداروں میں ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے اور وہ عدم استحکام کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ہم قوموں کی ترقی کو ان کی مجموعی قومی پیداوار کی بنیاد پر ناپتے ہیں۔ اس لئے ہم غلط نتائج حاصل کرتے ہیں اور یہ ایسی غلطیاں ہیں جن کے نتائج بڑے المناک ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ ہم مجموعی قومی پیداوار میں تیز رفتار ترقی حاصل کرنے والے معاشرے کو دنیا بھر کے دوسرے معاشروں میں نمونے کے طور پر پیش کریں۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ یہ ترقی سماجی استحکام کی قیمت پر حاصل کی گئی ہے۔ مغرب نے اسی طرح دنیا کو عدم استحکام کا شکار کیا ہے۔ ہم نے خود کو قائل کر لیا ہے کہ دنیا میں صرف ایک اور ایک ہی اقتصادی اور سماجی نمونہ ہے اور وہ ہمارا ہے۔ اسے پوری دنیا پر نافذ کرنے کے لئے ہم نے دنیا کے تقریباً ہر کونے میں اپنی بیماریوں کو پہنچایا ہے۔ جرم، منشیات، شراب، خاندانی توڑ پھوڑ، شہروں کے پسماندہ علاقوں میں شہری بدنظمی، تیز رفتار ماحولیاتی آلودگی اور اس قسم کے دوسرے مسائل جن کا ہم روزانہ سامنا کرتے ہیں، وہ بیماریاں ہیں جو ہم نے دنیا کے کونے کونے میں پھیلائی ہیں۔ ہم ان بیماریوں کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ ہم دنیا کو یہ بتانے سے نہیں جھجکتے کہ یہ سب کچھ صحت مند اقتصادی ترقی اور خوشحالی کا لازمہ ہیں۔

ہم اپنے مسائل کی وجوہات کو سمجھنے میں ناکام ہوتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہم ان مسائل کو حل کرنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ ہم صرف مرض کی علامتوں کا تدارک کرتے ہیں۔

''اس کے باوجود آپ اتفاق کرتے ہیں ترقی ضروری ہے؟''

یقیناً...... لیکن یہ یاد رکھنا اہم ہے کہ اقتصادی ترقی صرف اسی وقت تک سودمند ہوتی ہے جب تک وہ معاشرے کی ضروریات کو پورا کرتی ہے، استحکام کو مضبوط کرتی اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قناعت کو فروغ دیتی ہے۔ معیشت ایک ایسا وسیلہ ہے جو ہماری خدمت کرتا ہے۔ یہ کوئی دیوتا نہیں جس کی خدمت معاشرہ کرے۔ اپنی اس گفتگو کے دوران میں تین ایسی مثالیں پیش کروں گا، جن سے پتہ چلے گا کہ ہم نے کس طرح ناعاقبت اندیشانہ جدید اقتصادی آلات کے استعمال سے اپنے سماجی استحکام کو تباہ و برباد کیا ہے۔

''وہ کیا ہیں؟''

عالمی آزاد تجارت، عمیق زراعت اور ایٹمی قوت۔ یہ تینوں چیزیں روشن خیالی کی دین ہیں۔ اسی لئے جدید روایتی ذہانت ان کی پوجا کرتی ہے۔

''کیا آپ کسی ایسے قومی لیڈر کو جانتے ہیں جو ان مسائل کو سمجھتا ہے؟''

ایسے لوگ بہت کامیاب ہیں۔ تقریباً ہر قومی حکومت نتائج کو سمجھنے کی کوشش کئے بغیر یہی کھاتوں اور پیمائش کے جال میں پھنس چکی ہے فرانس میں گزشتہ بیس برسوں میں مجموعی قومی پیداوار 80 فیصد تک بڑھی ہے اور یہ کارکردگی حیران کن ہے اور اسی عرصے کے دوران بیروزگار افراد کی تعداد چار لاکھ بیس ہزار سے بڑھ کر اکیاون لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ (سرکاری اعداد وشمار کے مطابق یہ تعداد 33 لاکھ ہے لیکن خود حکومت کے اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ مختلف درجوں کے 18 لاکھ افراد ان میں شامل نہیں کئے گئے)۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ترقی حاصل کی جا سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی پچاس لاکھ افراد کی معاشرے میں عدم شرکت سے حکومت کو اس جانب بھی توجہ مبذول کرنا پڑے گی۔ اسے اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔ یاد رہے کہ امریکہ میں دو کروڑ بیس لاکھ افراد بیروزگاری کا شکار ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود فرانس کی حکومت نے اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی نہیں کی۔ بس سنتے ہیں تو یہ کہ اگر ہم مجموعی قومی پیداوار کی افزائش میں آدھے یا ایک فیصد کا اضافہ کرلیں تو سب کچھ بچ سکتا ہے۔ برطانیہ میں مجموعی قومی پیداوار میں 97 فیصد اضافہ کے باوجود 1961ء سے 1991ء کے درمیان کے عرصے میں غربت و افلاس کی زندگی گزارنے والوں کی تعداد 53 لاکھ سے بڑھ کر ایک کروڑ چودہ لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔

بہرحال، کبھی کبھار دنیا کے کسی نہ کسی کونے میں آدمی کا اس سے مختلف سوچ سے واسطہ ضرور پڑتا ہے۔ ایک مرتبہ میں ویسٹ انڈیز کے ایک چھوٹے سے جزیرے انگوئیلا گیا۔ اس وقت اس جزیرے کی آبادی نو ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ میں نے اس وقت کے وزیراعظم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا۔ یہ جزیرہ بے حد خوبصورت ہے۔ اس کے ساحل طویل اور سفید ہیں اور لوگ بڑے ہی مہمان نواز۔ میں نے وہاں کے وزیراعظم سے جزیرے کو ترقی دینے کے منصوبوں کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے جو جواب دیا وہ کم و بیش یہ تھا ''یہ جزیرہ ہمارا جزیرہ ہے اور ہم یہاں بڑے خوش ہیں۔ ہمارے پاس دو متبادل ہیں۔ یا تو ہم اسے مناسب رفتار پر اور ایسے انداز میں ترقی دیں جس سے روزگار کے وسائل حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے لوگ بھی خوشحال ہوں یا ہم اس پالیسی کو اپنائیں جو ہمارے تمام ہمسایہ جزیروں نے خصوصاً اپنے ہاں نافذ کی ہے کہ ہم تیز رفتار اور زیادہ سے زیادہ ترقی کو اپنا مقصد بنائیں۔ کافی سوچ بچار کے بعد ہم نے پہلی پالیسی کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔ اگر ہم نے سیاحت کو تیز رفتار کے ساتھ فروغ دینے کا فیصلہ کر لیا ہوتا اور بڑے ہوٹل اور ساتھ ساتھ قطار اندر قطار بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کر لی ہوتیں تو ہمیں بڑی تعداد میں دوسرے علاقوں سے لوگوں کو یہاں لا کر بسانے کی پالیسی اختیار کرنا پڑتی تاکہ ایسی معیشت کو چلایا جا سکے۔ ہم نے سوچا کہ اس طرح تو ہم اپنے ہی ملک میں ایک اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔ پھر ہمارے ہاں جرم اور منشیات اور وہ دوسری سماجی برائیاں بھی تیزی کے ساتھ پھیلتیں جو تیز رفتار ترقی سیاحت اور ترک وطن کا لازمی جزو ہوتی ہیں۔ ہمارا جزیرہ وہ نہ رہتا جو آج ہے۔ اسی لئے میں نے ہمیشہ یہ مہم چلائی ہے کہ ایسی مناسب ترقی پر ہی قناعت کرنی چاہئے جس سے ہمارے لوگوں کے لئے بہتر روزگار میسر ہو سکے اور اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنی طرز زندگی کو بھی برقرار رکھ سکیں۔''

یقیناً وہاں اس شخص کے سیاسی مخالفین بھی تھے جن کا نقطہ نظر بالکل الٹ تھا۔ ہمسایہ جزائر میں زمین کی قیمت بہت زیادہ تھی۔

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ میں ویت نام گیا اور وہاں ایسے لوگوں کے گروپ سے ملنے کا اتفاق ہوا جو کمیونزم سے باہر نکلتی ہوئی اپنی قوم کے لئے بہتر حکمت عملی تیار کرنے کے ذمہ دار تھے۔ ان کے ذہنوں میں جس قسم کا معاشرہ ہے اور جس کا خاکہ وہ ابھی تک مکمل نہیں کر پائے، وہ ''دبستان ہوچی منہ'' کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ہماری بات چیت کے دوران ایک سوال بار بار سامنے آتا رہا کہ ''مزید بنکاک، ریوڈی جنیرو اور میکسیکو سٹی جیسے بڑے شہر تخلیق کئے بغیر ہم مارکسزم، لینن ازم سے آگے بڑھ کر دبستان ہوچی منہ کی طرف

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کیسے آ سکتے ہیں۔ ہم شہروں میں ہارلم اور واٹس جیسے پسماندہ شہری علاقوں سے کس طرح اجتناب کر سکتے ہیں۔'' ان لوگوں کے پاس اتنی ذہانت تھی کہ وہ اقتصادی ترقی کے بڑے مسائل کی شناخت کر سکتے تھے۔ اب آتے ہیں ہم آخری مثال کی طرف۔ میں جب ہمالیہ کے علاقہ میں بھوٹان کے دورے پر تھا تو وہاں کے بادشاہ نے لوگوں سے اپنے سالانہ خطاب میں اعلان کیا تھا کہ وہ مجموعی قومی پیداوار کی نسبت مجموعی قومی قناعت میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

''تو پھر، یہاں سے اب ہم کہاں جائیں؟''

مسائل بڑے گھمبیر ہیں اور اتنے پھیلے ہوئے ہیں کہ ان کا جواب سیدھے سادھے حل سے نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن ہم بہت سی مثالوں کے ساتھ بات کرتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہم نے مغرب میں اپنا راستہ کیسے کھویا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان بحث مباحثوں کے دوران ہم کسی نہ کسی حل کے قریب پہنچنے کے قابل ہو جائیں گے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب2

نیا یوٹوپیا

نرخوں اور تجارت کا عمومی معاہدہ (GATT)
اور بین الاقوامی آزاد تجارت

''آپ بین الاقوامی آزاد تجارت کے مخالف ہیں، اس لئے GATT کے بھی مخالف ہیں۔ کیوں؟''

بین الاقوامی آزاد تجارت، یعنی جدید اقتصادی نظریہ کا ایک مقدس اصول، ایک طرح کا تسلیم شدہ اخلاقی اصول بن چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیزی کے ساتھ تبدیل ہوتی ہوئی عالمی معیشت پر اس کے اثرات کا دوبارہ جائزہ لینے کے لیے سیاستدانوں اور ماہرین اقتصادیات کو قائل کرنا بے حد مشکل ہے۔

بین الاقوامی آزاد تجارت کا بنیادی مقصد، مصنوعات، خدمات، سرمائے اور لیبر کی دنیا بھر میں مارکیٹ پیدا کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جنرل ایگریمنٹ آن ٹیرفس اینڈ ٹریڈ GATT (نرخوں اور تجارت کا عمومی معاہدہ) کو آلہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ GATT کی بنیاد ہے۔

آزاد تجارت کا پہلا نظریہ ساز ابتدائی انیسویں صدی کا برطانوی ماہر اقتصادیات ڈیوڈ رکاڈو تھا۔ وہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے یعنی خصوصی مہارت (سپشلائزیشن) اور نسبتی فوقیت (Compartive Advantage) پر یقین رکھتا تھا۔ رکاڈو کے مطابق ہر قوم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو ایسے شعبوں میں خصوصی مہارت حاصل کرنی چاہئے جن میں اسے فوقیت حاصل ہو سکتی ہے تا کہ دوسرے ممالک کی نسبت ان شعبوں میں وہ بہت آگے جا سکے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر ملک کو چاہئے کہ وہ خود کو کسی ایک شعبہ تک محدود کر لے اور اس مقصد کے لئے بعض صنعتوں کو وہ خیر باد کہہ دے اور ان صنعتوں کو فروغ دے جن سے وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسی بین الاقوامی تجارت کا فروغ حاصل ہو گا جن میں تمام ممالک اپنی زائد پیداوار کو برآمد اور ایسی مصنوعات کو درآمد کریں گے جو اب ان کے ہاں تیار نہیں ہوتیں۔ اس سے کارکردگی اور پیداوار میں تدریجی معیشتوں کے مطابق اضافہ ہو گا اور خوشحالی بڑھے گی لیکن آج کی دنیا میں یہ تصورات معتبر اور درست نہیں ہیں۔

"کیوں؟"

گزشتہ کچھ برسوں کے دوران چار ارب افراد اچانک عالمی معیشت میں داخل ہوئے ہیں۔ ان میں چین، بھارت، ویت نام، بنگلہ دیش اور دوسروں کے علاوہ سویت یونین سے الگ ہونے والے ممالک کی آبادیاں شامل ہیں۔ یہ آبادیاں تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہیں۔ آئندہ پینتیس برس میں 4 ارب افراد کی یہ تعداد بڑھ کر ساڑھے چھ ارب تک پہنچ جائے گی۔ ان ملکوں میں بے روزگاری کی شرح بہت زیادہ ہے اور وہ لوگ جو روزگار حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، وہ ترقی یافتہ دنیا کے کارکنوں کی تنخواہ کا بہت ہی معمولی حصہ حاصل کر پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر فرانس جیسے ترقی یافتہ ملک کا ایک فرد جتنی تنخواہ حاصل کرتا ہے، اس تنخواہ میں سینتالیس ویت نامی یا فلپائنی افراد ملازم رکھے جا سکتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے تک یہ چار ارب افراد اپنے سیاسی نظام، بنیادی طور پر کمیونسٹ یا سوشلسٹ نظام کی وجہ سے اور ٹیکنالوجی اور سرمائے کی کمی کی وجہ سے ہماری معیشت سے الگ تھے۔ لیکن آج سب کچھ بدل چکا ہے۔ ان کے سیاسی نظام میں تبدیلی آ چکی ہے۔ مائیکرو چپ کے ذریعے ٹیکنالوجی کو دنیا کے کسی بھی حصے میں فوری طور پر منتقل کیا جا سکتا ہے اور جہاں سے زیادہ منافع حاصل ہو سکتا ہے، وہاں سرمایہ کاری کے لیے سرمایہ موجود ہے۔

بین الاقوامی آزاد تجارت کا اصول یہ ہے کہ کوئی بھی شے کہیں بھی تیار کی جا سکتی ہے اور اسے دنیا میں کہیں بھی فروخت کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عالمی معیشت میں داخل ہونے والے ان لوگوں کا براہ راست مقابلہ ترقی یافتہ ممالک کے محنت کشوں کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ساتھ ہے۔ وہ اسی بین الاقوامی لیبر مارکیٹ کا حصہ ہیں۔ مثال کے طور پر دو اداروں کو لیجئے۔ ان میں سے ایک ترقی یافتہ دنیا میں اور دوسرا ویت نام میں ہے۔ دونوں ایک ہی قسم کی شے تیار کرتے ہیں جو ایک ہی مارکیٹ میں فروخت ہو گی۔ چلئے امریکہ، برطانیہ یا فرانس میں فروخت ہو گی۔ دونوں ہی ادارے ایک ہی طرح کی ٹیکنالوجی استعمال کر سکتے ہیں اور دونوں ادارے بین الاقوامی سرمائے تک رسائی رکھتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ویت نامی ادارہ سینتالیس افراد کو ملازم رکھتا ہے جبکہ فرانسیسی ادارہ صرف ایک فرد کو ملازم رکھ سکتا ہے۔ اب یہ سمجھنے کے لیے زیادہ ذہانت کی ضرورت نہیں کہ اس مقابلے میں کامیاب کون ہوگا۔

زیادہ تر ترقی یافتہ ممالک کے صنعتی اداروں میں کارکنوں کو جو تنخواہ دی جاتی ہے وہ ان اداروں کی مصنوعات کی کل فروخت کے 25 سے 30 فیصد کے برابر ہوتی ہے۔ اگر ایسا ادارہ اپنے ملک میں صرف اپنا ہیڈ آفس اور سیلز فورس قائم رکھنے کا فیصلہ کرے اور اپنی مصنوعات کی پیداوار کم لاگت والے علاقے میں منتقل کر دے تو اس طرح وہ اپنی مصنوعات کی کل فروخت میں سے بیس فیصد بچت کرے گا۔ لہٰذا 500 ملین ڈالر مالیت کی مصنوعات فروخت کرنے والا ادارہ ٹیکس کی ادائیگی کے پہلے ہر سال 100 ملین ڈالر تک منافع میں اضافہ کرے گا۔ اور اگر وہ اپنے ہی ملک میں مصنوعات تیار کرے تو وہ ادارہ کم لاگت والی درآمدی مصنوعات کا مقابلہ نہیں کر سکے گا اور ختم ہو جائے گا۔

ایسی اقتصادی پالیسی کو اپنانا یقیناً ایک فاش غلطی ہو گی جو آپ کو اپنے ملک کی لیبر فورس ختم کر کے اور پیداوار کو دوسرے ممالک میں منتقل کر کے امیر کبیر بنا دے۔ ایسی اقتصادی پالیسی کس کام کی جس کے تحت اگر آپ اپنے لوگوں کو روزگار مہیا کریں تو اس سے آپ دیوالیہ ہو جائیں۔

> ”لیکن غیر ملکوں میں صنعتیں لگانے والے ادارے وہ ہیں جو بہت بڑی تعداد میں کارکن ملازم رکھتے ہیں۔ مستقبل کی ہائی ٹیک صنعتوں کی وجہ سے روزگار کے جو مواقع پیدا ہوں گے وہ اس کی تلافی کر دیں گے“۔

بلاشبہ ہائی ٹیک انڈسٹریز صرف اس وجہ سے ان حالات میں زندہ رہ سکتی اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خوشحال ہو سکتی ہیں کہ وہ انتہائی خودکار ہوں۔ ان میں صرف چند کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ صنعتیں جو مصنوعات تیار کرتی ہیں، ان کی کل لاگت میں محنت ایک چھوٹا سا جزو ہوتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ صنعتیں ضائع شدہ پیداواری محنت کی تلافی نہیں کر سکتیں۔ یہ حقیقت کہ وہ چند افراد کو ملازم رکھتی ہیں۔ اس بات کا مظہر ہے کہ وہ زیادہ افراد کو ملازم رکھنے کے قابل نہیں ہیں۔ جونہی انہیں مناسب تعداد میں ملازموں کی ضرورت پڑے گی تو وہ دوسرے ملکوں کا رخ کرنے پر مجبور ہوں گے۔ مثال کے طور پر آئی۔بی۔ ایم اپنی ڈرائیو کا کاروبار امریکہ اور مغربی یورپ سے ان ملکوں کی طرف لے جا رہی ہے جہاں اجرت بہت کم ہے۔ اخبار ''وال سٹریٹ جرنل'' کے مطابق آل بی ایم اپنا یہ ادارہ کسی غیر معین شراکت دار کے ساتھ شراکتی کاروبار کے طور پر شروع کر رہا ہے تاکہ جب مناسب سمجھا جائے تو اسے کسی ایسے علاقے میں منتقل کیا جا سکے جہاں اجرت بہت ہی کم ہے۔ زیادہ اجرت والے علاقوں کے مقابلے میں ایشیا کی طرف منتقل ہونے کی وجہ سے ڈسک ڈرائیور کی اسمبلنگ کی لاگت آدھی رہ جائے گی۔ آئی۔بی۔ایم کے مسٹر شاؤ نے تسلیم کیا ہے کہ اس قسم کے فیصلوں سے آئی۔ بی۔ ایم صرف اپنے رقیبوں کے برابر آ جائے گی۔ طیارے تیار کرنے والے ادارے بوئنگ نے اعلان کیا ہے کہ وہ کچھ پیداوار چین منتقل کر دے گا۔ سلی کون ویلی تخلیق کرنے والی کمپنیوں ہاویٹ پیکارڈ اور ایڈوانسڈ مائیکرو ڈیوائسز وغیرہ کم اجرت والے ملکوں کی طرف رخ کر رہی ہیں۔

بین الاقوامی آزاد تجارت کے حامی کہتے ہیں کہ انتہائی تیز رفتار ٹرینوں، ہوائی جہازوں اور سیٹلائٹوں جیسی ہائی ٹیک مصنوعات کی برآمد بڑے پیمانے پر روزگار کے مواقع میسر کرے گی۔ لیکن افسوس کہ یہ سچ نہیں ہے۔ فرانس نے حال ہی میں جنوبی کوریا کو 2.1 بلین ڈالر کی تیز ترین ٹرینیں فروخت کرنے کا جو معاہدہ کیا اس کے نتیجے میں فرانس میں صرف چار برس کے لیے آٹھ سو ملازمتیں پیدا کی گئیں۔ ان میں سے 525 ملازمتیں مرکزی سپلائر اور 275 چھوٹے کنٹریکٹروں کے لئے ہیں۔ زیادہ تر کام کوریا میں ایشیائی کمپنیاں ایشیائی ملازمین کے ذریعے انجام دے رہی ہیں۔ جنوبی کوریا کو ٹیکنالوجی منتقل کرنے کے بعد یہ ہوگا کہ چند برسوں کے دوران ایشیا یہ تیز ترین ٹرینیں فرانس کو نظر انداز کر کے براہ راست جنوبی کوریا سے خریدنے کے قابل ہو جائے گا۔ جہاں تک طیاروں اور سیٹلائٹوں کا تعلق ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تو فرانس میں ان صنعتوں میں ملازمین کی تعداد تیزی کے ساتھ کم ہوئی ہے۔ 1987ء سے 1992ء تک کے پانچ برسوں کے دوران ملازمین کی تعداد ایک لاکھ تیئس ہزار سے کم ہو کر ایک لاکھ دس ہزار تک آ گئی ہے اور توقع ہے کہ مختصر سی مدت میں یہ تعداد مزید کم ہو کر ایک لاکھ دو ہزار تک ہو جائے گی۔

ہماری بڑی غلطیوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ جب ہم تجارت میں توازن کی بات کرتے ہیں تو ہم محض مالیاتی اصطلاحات میں بات کرتے ہیں۔ اگر ہم ایک ارب ڈالر قیمت کی اشیاء برآمد کریں اور اتنی ہی مالیت کی اشیا درآمد کریں تو کہتے ہیں کہ ہماری غیر ملکی تجارت متوازن ہے۔ ہماری برآمدات کی قیمت ہماری درآمدات کی قیمت کے برابر ہے لیکن یہ سطحی قسم کا تجزیہ ہے اور اس سے غلط نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ ہم جو مصنوعات برآمد کرتے ہیں، ضروری ہے کہ وہ ایسی مصنوعات ہوں جن کی تیاری میں کم سے کم محنت خرچ ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ کم اجرات والے ملکوں میں تیار ہونے والی مصنوعات کا مقابلہ نہیں کر سکیں گی اور یوں ان کی مصنوعات برآمد نہیں ہو سکیں گی۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ایک ارب ڈالر مالیت کی ہائی ٹیک مصنوعات تیار کرنے کے لیے سالانہ ایک ہزار سے بھی کم کارکنوں کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں کم اجرت والے ملکوں میں ان مصنوعات کی تیاری کے لیے جو ہم درآمد کرتے ہیں، لاکھوں افراد ملازم ہوں گے۔ اس لیے کہ یہ ہائی ٹیک مصنوعات نہیں ہیں بلکہ ملازمت کے روایتی معیار کے ساتھ مصنوعات تیار کی جائیں گی۔ اس لیے ہماری تجارت مالیاتی معنوں میں تو متوازن ہو گی لیکن ہم اگر مالیاتی اعداد و شمار سے آگے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ روزگار کے معنوں میں انتہائی خوفناک عدم توازن ہے۔ یہ وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے ہم روزگار برآمد کرتے اور بیروزگاری درآمد کرتے ہیں۔

> ''لیکن بہت سے ماہرین اقتصادیات سمجھتے ہیں کہ خدمات کی صنعتوں کا فروغ مینوفیکچرنگ کے شعبہ میں ختم ہو جانے والے روزگار کا متبادل ہے۔''

خدمت (سروس) مہیا کرنے والی صنعتیں بھی کم لاگت والے ملکوں کی طرف روزگار منتقل کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔ عصر حاضر میں سیٹلائٹ کے ذریعے آپ دور دراز

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے ملکوں میں اپنے دفاتر کے ساتھ مستقل رابطہ قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کمپنیاں اپنے ملکوں کے اندر دفاتر بند کر کے دنیا کے کسی بھی علاقے میں روزگار منتقل کر سکتی ہیں۔ سوئس ایئر نے حال ہی میں اپنے شعبہ اکاؤنٹس کا ایک بڑا حصہ بھارت منتقل کیا ہے۔

''اس کے باوجود بعض خدمات (سروسز) مثلاً صحت اور تعلیم وغیرہ کو
سمندر پار منتقل نہیں کیا جا سکتا۔''

یہ صحیح ہے لیکن ہمیں چاہیے کہ ہم عملی نتائج کے ذریعے اس کو پرکھیں۔ کسی بھی ملک کی معیشت دو بڑے حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔ ایک وہ جو دولت پیدا کرتی ہے اور دوسری وہ جو اسے تقسیم کرتی ہے، اسے خرچ کرتی ہے۔ اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ آخر الذکر کوئی کم رتبہ چیز ہے۔ اس میں صحت اور تعلیم جیسی انتہائی اہم سرگرمیاں شامل ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ دونوں قسم کی سرگرمیوں کا تعین قومی پیداوار کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ معیشت کے اس شعبہ کو کم نہیں کیا جا سکتا جو دولت پیدا کرتا ہے اور اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ دوسرے شعبہ کو یعنی خرچ کرنے والے شعبہ کو برقرار رکھے گا۔ تمہیں جتنا خرچ کرنا ہے پہلے اسے کماؤ۔

''غالباً مختلف کرنسیوں کے درمیان شرح تبادلہ بھی مقابلہ کی قوت پر
کافی اثر چھوڑتی ہے۔''

یقیناً ایسا ہی ہوتا ہے۔ رکارڈو نے تقابلی فائدے کا تخمینہ زر کی اصطلاحات ہی میں لگایا۔ اگر فرانس میں کسی شے پر ایکس فرانکس اور امریکہ میں وائی ڈالر لاگت آتی ہے تو آپ کو صرف تبادلہ کی موجودہ شرح پر ڈالروں کو فرانکس میں تبدیل کرنا ہوتا ہے اور اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ فائدہ کہاں ہے۔ دوسرے لفظوں میں سستی شے تیار کرنے والا ملک ہی تقابلی فائدہ حاصل کرنے والا ملک ہوتا ہے۔

لیکن کسی بھی ایک کرنسی کی قیمت میں کمی یا اس کی قیمت دوبارہ متعین کر کے اس تخمینہ کی اچانک طور پر کایا کلپ کی جا سکتی ہے۔ 1981ء میں ایک ڈالر کی قیمت 4.5 فرانسیسی فرانک تھی۔ 1985ء تک ڈالر کی قیمت تیزی سے اوپر گئی اور اس کی قیمت 10 فرانسیسی فرانک ہو گئی۔ 1992ء تک ڈالر دوبارہ نیچے آ گیا اور اس کی قیمت 4.80 فرانسیسی فرانک رہ گئی۔ سو آپ ایک شے کو لیں جو 1981ء میں امریکہ یا فرانس میں تیار کی گئی لیکن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کی لاگت ایک ہی تھی۔ چار سال بعد 1985ء میں فرانس کے مقابلے میں امریکہ میں یہ دوگنی سے بھی زیادہ مہنگی ہوگئی۔ یہ صرف فرانک کے مقابلے میں ڈالر کی قیمت میں اضافہ کا مظہر تھی۔ اس کے باوجود رکارڈو کہتا ہے کہ ہر ملک کو چاہیے کہ وہ ایسی مصنوعات میں سپیشلائز کرے جن میں اسے تقابلی فائدہ ہو۔ اگر آپ اس استدلال کی پیروی کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امریکہ میں جن صنعتوں پر آپ نے 1981ء میں تمام تر توجہ دی تھی تو 1985ء میں ان سے دستبردار ہو جانا چاہیے تھا۔ اور اس کے پیچھے دلیل یہ ہوتی کہ محض مالیاتی وجوہ کی بناء پر تقابلی فائدہ ختم ہو گیا تھا۔ اور جب 1992ء میں ڈالر کی قیمت دوبارہ گری تو اس نظریے کے مطابق آپ امریکہ میں اس صنعت کو دوبارہ زندگی مہیا کرتے۔ اسے بے ہودگی کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔ کسی کو بھی شرح تبادلہ کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ نہ تو صنعتیں ختم کرنی چاہئیں اور نہ ہی انہیں دوبارہ پاؤں پر کھڑا کرنا چاہیے۔

> ''وہ لوگ جو بین الاقوامی آزاد تجارت کے حامی ہیں، یقیناً آپ کے دلائل کو رد کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے پہلے تو وہ او ای سی ڈی اور عالمی بنک کی طرف سے شائع کردہ مشترکہ تحقیقی رپورٹ کا حوالہ دیتے ہیں۔ جس میں کہا گیا ہے کہ GATT کی تجاویز پر عمل درآمد سے دنیا کی آمدنی ہر سال 213 ارب ڈالر کا اضافہ ہوگا۔ ہم اس ترقی سے کیسے انکار کر سکتے ہیں؟''

اگر آپ رپورٹوں کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ اضافہ ایسی پیش گوئی ہے جو تقریباً دس برس میں ممکن ہوگا۔ ہاں، 213 ارب ڈالر ایک خطیر رقم ہے لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے آپ کو اس مقابلہ دنیا کی مجموعی قومی پیداوار کے ساتھ کرنا پڑے گا، اس لیے کہ یہ پیش گوئی ہے جو دس سال میں حقیقت ثابت ہوگی۔ 213 ارب ڈالر 0.7 فیصد ہی تو ہے۔ مزید برآں او ای سی ڈی (O.E.C.D) کے جنرل سیکرٹری نے رپورٹ کو بہت زیادہ نظری قرار دیا ہے۔

> ''یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ بین الاقوامی آزاد تجارت کے ذریعے کم لاگت کی لیبر سے تیار ہونے والی سستی درآمدی مصنوعات کو خریدنے کی اہلیت سے صارفین فائدہ اٹھا سکیں گے۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صارفین محض وہ لوگ نہیں ہوتے جو مصنوعات خریدتے ہیں، یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو محنت کے ذریعے روزی کماتے ہیں اور ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ صارفین کی حیثیت سے وہ چند مصنوعات زیادہ سستی خریدنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھئے کہ نکے (Nike) نے مصنوعات کی پیداوار امریکہ سے ایشیا کو منتقل کر دی تھی لیکن اس کے باوجود جوتوں کی قیمتیں نیچے نہیں آئیں بلکہ منافع کی گنجائش بڑھ گئی تھی لیکن سستی اشیاء کی جو اصلی قیمت صارفین کو ادا کرنی پڑے گی وہ ان کی بیروزگاری، ان کی اجرت میں کمی آ جائے گی اور بڑھتی ہوئی بیروزگاری کی قیمت کو پورا کرنے کے لیے ہمیں ٹیکسوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ صارفین شہری بھی ہوتے ہیں، جن میں سے اکثر قصبوں میں رہتے ہیں۔ جیسے جیسے بیروزگاری بڑھتی ہے، غربت بھی بڑھتی ہے، قصبے اور شہر اس سے بھی زیادہ عدم استحکام کا شکار ہوں گے۔

''بڑھتی ہوئی بیروزگاری سے متعلق آپ کی دلیل کو میں سمجھتا ہوں لیکن آمدنیوں میں کمی ہو جائے گی؟''

امریکہ کے محکمہ محنت نے جو اعداد و شمار جاری کئے ہیں، ان کے مطابق 1973ء سے افراط زر کی نسبت سے فی گھنٹہ اور ہفتہ وار آمدنیوں میں پہلے ہی بالترتیب 13.4 فیصد اور 19.2 فیصد کمی واقع ہوئی ہے اور یہ سب کچھ حالیہ GATT مذاکرات (جو یوروگوائے راؤنڈ کے نام سے پہچانے جاتے ہیں) سے پہلے ہوا۔ اگر اسی عالمی مارکیٹ میں چار ارب افراد محنت کے لئے شامل ہوں اور خود کو اس قیمت پر کام کرنے کے لیے پیش کریں جو ترقی یافتہ دنیا کے لوگوں کی اجرت کا بہت ہی معمولی حصہ ہو، تو اس سے ثابت ہوگا کہ سپلائی میں اس قسم کا بہت زیادہ اضافہ محنت کی قدر کو کم کر دے گا۔ اس کے علاوہ منظم لیبر اپنی مذاکراتی قوت عملی طور پر ختم کر بیٹھے گی۔ جب ٹریڈ یونینس رعائتیں مانگیں گیں تو جواب یہ ہوگا کہ اگر تم ہم پر زیادہ تر دباؤ ڈالو گے تو ہم دوسرے ملکوں کو چلے جائیں گے جہاں ہمیں بہت سستی لیبر مل سکتی ہے، جو نہ تو ملازمت کا تحفظ مانگتی ہے، نہ چھٹیاں مانگتی ہے اور نہ ہی وہ سب کچھ جس کے بارے میں تم لوگ مذاکرات کرنا چاہتے ہو۔

بین الاقوامی آزاد تجارت اسی انداز میں بکھر جائے گی جس انداز میں سرمائے اور محنت کے درمیان اضافی قدر بٹتی یا تقسیم ہوتی ہے۔ اضافی قدر دراصل قدر یا قیمت کا وہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اضافہ ہے جو خام مال کو تیار شدہ پراڈکٹ میں تبدیل کر کے حاصل ہوتا ہے۔ بالغ معاشروں میں ہم ایک عمومی سمجھوتہ تیار کرنے کے قابل ہو چکے ہیں کہ اسے کس طرح آپس میں تقسیم کیا جائے۔ یہ سمجھوتہ بے شمار سیاسی مباحثوں، انتخابات، ہڑتالوں، واک آؤٹ اور دوسرے تنازعات کے بعد تیار ہو سکا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کی اجارتوں سے کہیں کم اجرت پر کام کرنے کے لیے تیار لوگوں کی بڑی بھاری تعداد کے آ جانے سے یہ سمجھوتہ ایک ہی رات میں تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اس سے جو سماجی تقسیم ہو گی وہ مارکس کے تصور سے بھی کہیں زیادہ سنگین ہو گی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ امریکہ کے بہت سے ماہرین اقتصادیات سمجھتے ہیں کہ افراط زر کو بڑھانے والی قوتیں، جو عام طور پر نرم یا آزاد مالیاتی پالیسی کے زمانے کی پیروی کرتی ہیں، اس موقع پر اسی انداز سے رونما نہیں ہوں گی۔ ان کا کہنا ہے کہ بین الاقوامی آزاد تجارت سے پیدا ہونے والی آمدنی کی مسلسل کمی، ''نیفٹا'' (نارتھ امریکن فریڈ ٹریڈ ایگریمنٹ) (Nafta) جس نے میکسیکو، (امریکہ اور کینیڈا کے درمیان کھلی مارکیٹ پیدا کی) کے اثرات سمیت اور اس حقیقت کے باوجود کہ فیڈرل ریزرو نے طویل ترین عرصے کے لیے ڈھیلی ڈھالی مالیاتی پالیسی کو برقرار رکھا، افراط زر کو روکے گی۔ دوسرے لفظوں میں محنت کش کو اس آسان دولت کی جاری پالیسی کے نتائج برداشت کرنا پڑیں گے اور افراط زر سے پیدا ہونے والی کمی پوری کرنے کے لیے کم آمدنی قبول کرنا ہو گی۔

''بین الاقوامی آزاد تجارتی نظام میں کون ہارے گا اور کون جیتے گا؟''

ہار انہی کی ہو گی جو کم لاگت والے علاقوں میں پیداوار منتقل ہو جانے کے نتیجے میں بیروزگار ہوں گے۔ ان میں وہ بھی ہوں گے جو اس لیے بیروزگار ہوں گے کہ ان کے آجر غیر ملکوں میں نہ جا کر بھی مقامی طور پر سستی درآمدی مصنوعات کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے اور آخر کار وہ بھی ہوں گے جن کی اجرت کی اہلیت، محنت کے علاوہ اضافی قدر کی تقسیم میں تبدیلی کی وجہ سے کم ہو گئی ہو گی۔

جیت ان کی ہو گی جو بہت سستی محنت کی بے انتہا فراہمی سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ یہ وہ ادارے ہوں گے جو اپنی پیداوار کو کم لاگت والے ملکوں میں منتقل کر دیں گے۔ یہ وہ ادارے ہوں گے جو اندرون ملک کم تنخواہیں ادا کریں گے اور وہ ادارے ہوں گے جن

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے پاس سستی ترین لیبر والے علاقوں میں سرمایہ کاری کے لیے سرمایہ ہوگا اور جو نتیجتاً بھاری منفع حاصل کریں گے۔ لیکن یہ ''پوکر'' جیتنے والوں جیسے ہوں گے۔ ان کے معاشروں کے جسموں پر جو زخم آئیں گے وہ بڑے گہرے ہوں گے اور ان کے نتائج انتہائی خطرناک ہو سکتے ہیں۔

ہمارے دور کا ایک عجوبہ بین البراعظمی کارپوریشنوں کا وجود میں آنا ہے۔ ان کارپوریشنوں کے پاس اتنی اہلیت ہوتی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے پیداوار کو دنیا کے کسی بھی حصے میں بھیج سکتی ہیں۔ تاکہ جہاں کہیں بھی اجرتیں کم ہیں وہاں سے وہ زیادہ سے زیادہ منافع کما سکیں۔ بین البراعظمی کارپوریشنوں کی کارکردگی دنیا بھر کی کارکردگی کا ایک تہائی ہے۔ دنیا بھر میں ان کی سالانہ فروخت 4.8 پدم (4.8 کرڑو کھرب) ڈالر تک پہنچ چکی ہے اور یہ کل بین الاقوامی تجارت سے کہیں زیادہ ہے۔ تمام غیر ملکی سرمایہ کاری کے ایک تہائی حصے پر، ایک سو بڑی ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کا کنٹرول ہے۔ ان کے لئے مارکیٹ کو بین الاقوامی بنانا ضروری رہے گا کہ وہ سستی مصنوعات بنا سکیں اور دنیا بھر میں ان مصنوعات کو فروخت کر سکیں چونکہ وہ ان ملکوں کے تابع نہیں ہیں جہاں وہ کام کرتی ہیں، اس لئے ان بین البراعظمی کارپوریشنوں اور ان ملکوں کے معاشروں کے معاملات کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ ترقی پذیر ملکوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہاں کے بیشتر قومی وسائل پر چند لوگوں کا قبضہ ہوتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو ان ملکوں کے قومی صنعتی، تجارتی اور مالیاتی اداروں کے مالک ہوتے ہیں اور وہ سستی لیبر اکٹھی کرتے ہیں جو ترقی یافتہ دنیا کے لیے مصنوعات تیار کرنے میں استعمال ہوتی ہے۔ چنانچہ امیر ملکوں کے غریب لوگ ہی غریب ملکوں کے امیروں کے لیے اپنے پاس سے ادائیگی کر کے ان کی شان و شوکت کو برقرار رکھتے ہیں۔ قوموں کے سماجی ربط پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔

''عالمی تجارتی تنظیم (ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن) کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟''

یہ وہ تنظیم ہے جس کے بارے میں تصور کیا جاتا ہے کہ یہ GATT کی جگہ لے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گی، بین الاقوامی تجارت کو نظم و ضبط میں لائے گی اور عالمی اقتصادی تکمیل کی طرف ہماری رہنمائی کرے گی۔ یہ بھی ایک اور بین الاقوامی دفتری حکومت ہے جس کے اہل کار زیادہ تر خودمختار ہوں گے۔ یہ 120 سے زائد ملکوں کو رپورٹ کرتے ہیں، اس لیے عملی طور پر کسی کو بھی رپورٹ نہیں کرتے۔ 120 میں سے ہر ملک کا ایک ووٹ ہوگا۔ چنانچہ امریکہ اور تمام یورپی ملک اپنی معیشت کا کنٹرول آخر کار بین الاقوامی دفتری بابوؤں کے ایک غیر منتخب، مطلق العنان گروہ کے حوالے کر دیں گے۔

''کیا ترقی یافتہ ملکوں کی یہ اخلاقی ذمہ داری نہیں کہ وہ تیسری دنیا کے لیے اپنی مارکیٹیں کھول دیں؟''

میں اپنی بات کا آغاز ہرمن ڈیلی (Herman Daly) اور رابرٹ گڈ لینڈ (Robert Goodland) کی رپورٹ میں سے حوالہ سے کرتا ہوں۔ یہ رپورٹ عالمی بینک نے شائع کی ہے۔ اگر کسی ملک نے دانشمندانہ پالیسی کے ذریعے یا محض قسمت کی یاوری سے اپنے ہاں آبادی میں اضافہ پر قابو پا لیا ہو اور وہ اپنے کارکنوں (یعنی اپنے زیادہ تر شہریوں کو) سی جی تحفظ مہیا کر سکتا ہو، انہیں بھاری معاوضے ادا کر سکتا ہو، ان کے لیے کام کے مناسب اوقات کا تعین اور دوسرے فائدہ مہیا کر سکتا ہو، تو کیا اسے اپنے ان فائدوں کو غیر منظّم و غیر مربوط تجارت کے ذریعے عالمی اوسط کی بھینٹ چڑھا دینا چاہیے؟ تیسری دنیا میں بیروزگاری آبادی میں ہونے والے تیز رفتار اضافہ کی وجہ سے اجرتوں کی سطح بہت نیچی رہے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ شمال (مغربی دنیا) کے مزدور بہت غریب ہو جائیں گے، جبکہ جنوبی دنیا کے مزدور اپنی پہلے والی حالت ہی پر رہیں گے۔

لیکن GATT پر عمل درآمد تیسری دنیا کے لیے بہت بڑے المیے کا سبب ہوگا۔ جدید ماہرین اقتصادیات کا خیال کہ زراعت کا شعبہ ایسا ہے جو کم سے کم لاگت پر زیادہ سے زیادہ خوراک پیدا کرتا ہے اور اس میں بہت کم افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بڑی اقتصادیات ہے۔ جب آپ زراعت کے طریقوں پر زور دیتے ہیں اور زمین پر کام کرنے والے افراد کی تعداد کم کر دیتے ہیں، تو جن لوگوں کو آپ فارغ کرتے ہیں وہ شہروں کا رخ کرتے ہیں۔ آپ دنیا میں کہیں بھی چلے جائیں شہروں میں آپ کو ان لوگوں کی گندی بستیاں ملیں گی جنہیں زمینوں پر سے نکال دیا گیا ہے۔ یہ زخم بڑا گہرا ہے۔ تیسری دنیا کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تمام ممالک میں خاندان ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں، دیہی علاقے ویران ہو گئے ہیں اور سماجی استحکام تباہ و چکا ہے۔ اس طرح برازیل میں گندی بستیاں جو "فیولاز" کے نام سے پہچانی جاتی ہیں، وجود میں آئیں۔

ایک اندازے کے مطابق دنیا بھر میں اب بھی 3.1 بلین افراد ایسے ہیں جن کی زندگیوں کا انحصار اراضی پر ہے۔ اگر GATT آسٹریلیا کا طرز کا زرعی نظام پوری دنیا میں نافذ کر دے تو پھر آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ دو بلین افراد بیکار ہو جائیں گے۔ ان میں سے کچھ شہروں کی مفلوک الحال بستیوں میں منتقل ہو جائیں گے، لیکن ان کی اکثریت اجتماعی ہجرت پر مجبور ہو جائے گی۔ آج ہم ان مسائل پر بحث مباحثہ کرتے ہیں، تو روانڈا کے المناک واقعات کی بنا پر وہاں سے ترک وطن کرنے والے بیس لاکھ افراد کے بارے میں گہری تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ GATT اگر کامیاب ہوتی ہے تو اس سے دنیا بھر میں جو نقل مکانی ہو گی، اس کا نتیجہ روانڈا کے لوگوں کی نقل مکانی سے ایک ہزار گناہ زیادہ ہولناک ہو گا۔ ہم دنیا کی آبادی کو خوفناک ترین المیے سے دو چار کرنے کے مرتکب ہوں گے۔

"لیکن تیسری دنیا کے ممالک عالمی آزاد تجارت کی حمایت کیوں کرتے ہیں؟"

ہمیں عوام اور ان کے حکمران کے درمیان فرق کو سامنے رکھنا چاہیے۔ عالمی آزاد تجارت کے حامی یہ حکمران ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اس سے فائدے حاصل ہوں گے۔ بھارت میں تقریباً دس لاکھ افراد نے اپنے دیہی رہن سہن، اپنے کلچر اور اپنی روایات کی تباہی و بربادی کے خلاف مظاہرے کئے ہیں۔ فلپائن میں ہزار ہا کسانوں نے GATT کے خلاف اس لیے احتجاج کیا کیونکہ یہ وہاں کے زرعی نظام کو تباہ و برباد کر دے گی۔

وندنا شیوا بھارت کی ایک ممتاز فلسفی اور ماہر طبیعیات ہیں۔ وہ بھارت کی ریسرچ فاؤنڈیشن برائے سائنس، ٹیکنالوجی اور نیشنل ریسورس پالیسی کی ڈائریکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ تھرڈ ورلڈ نیٹ ورک کی سائنس اور ماحولیات کی مشیر بھی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عالمی آزاد تجارت کا مطلب ہماری معاشرت کی مزید تباہی ہے۔ اس سے لاکھوں چھوٹے کسان زمینوں سے نکال دیئے جائیں گے اور شہروں کی غلیظ آبادیوں کی طرف ان کی منتقلی شہروں کی آبادی میں بے پناہ اضافہ کرے گی۔ GATT ہمارے ملک کی ثقافتی رنگا رنگی اور سماجی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

استحکام کو تباہ کر دے گی۔ ہمارے لیے GATT کا مطلب نو آبادیاتی نظام کا دوبارہ تسلط ہے۔

''ترقی پذیر ممالک آزاد عالمی تجارت کے بغیر کیسے ابھر سکتے ہیں؟''

ان ممالک کو جو صنعتی بننا چاہتے ہیں آزاد تجارت کے علاقے بنانے چاہئیں جیسا کہ حال ہی میں لاطینی امریکہ اور جنوب مشرقی ایشیا میں کیا گیا ہے۔ ان آزاد تجارتی علاقوں میں ان ممالک کو شامل ہونا چاہیے جن کی اقتصادیات، ترقی اور اجرتی ڈھانچوں کے حوالے سے ایک جیسی ہوں۔ یہ ٹریڈنگ ریجن دنیا بھر کی دوسری ریجنوں کے ساتھ مشترکہ فائدے کے دوطرفہ سمجھوتے کریں گے۔ ٹیکنالوجی اور سرمایہ کو منتقل کرنے کی آزادی برقرار رکھی جا سکے گی۔ اس طرح تجارتی ادارے جو اپنی مصنوعات ایک خاص علاقے میں بیچنے کے خواہشمند ہوں گے، مقامی طور پر مصنوعات تیار کریں گے، سرمایہ اور ٹیکنالوجی درآمد کریں گے اور مقامی طور پر روزگار پیدا کریں گے۔ یہ وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے ہم خود کو تباہ کئے بغیر ترقی پذیر دنیا میں خوشحالی اور استحکام پیدا کر سکتے ہیں۔

''کچھ لوگ کہیں گے کہ یورپ میں روزگار کا مسئلہ GATT کی وجہ سے نہیں بلکہ پرانی قسم کی ان بیماریوں کا نتیجہ ہے جو ان معاشرہ کا خاصہ ہوتے ہیں جن میں مقابلہ کی فضا نہیں ہوئی، جو غیر لچک دار اور بگڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ فلاحی ریاست کنٹرول سے باہر ہوتی ہے۔ سماجی ترقی پر اٹھنے والی لاگت جنہیں آجر برداشت کرتے ہیں، نئی ملازمتوں کے مواقع کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی، بھاری سرکاری اخراجات اور ٹیکسیشن معیشت کا گلا گھونٹ دیتے ہیں، ریاستی مداخلت مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے اور حکومت پر قابض مفاد پرستوں کا گروہ بہتری کے اقدامات میں رکاوٹ بنتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ کیا یہ درست نہیں ہے؟

یہ جزوی طور پر درست ہے اور ان امراض کا علاج پوری شدت کے ساتھ کرنا ضروری ہے۔ اگر علاج کامیاب بھی ہو تب بھی آزاد عالمی تجارت کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ تصور کر لیں کہ ہم سوشل چارجز اور ٹیکسیشن کو کم کر دیتے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں تا کہ لیبر پر اٹھنے والے اخراجات ایک تہائی کم ہو جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک فرانسیسی کو دی جانے والی اجرت پر سینتالیس ویت نامی یا سینتالیس فلپائنی افراد ملازم رکھنے کی بجائے آپ صرف اکتیس افراد کو ملازم رکھ سکیں گے۔

جیسا کہ ہم پہلے بحث کر چکے ہیں، آپ کو فرانس کی مثال ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے جہاں گزشتہ بیس برسوں میں مجموعی قومی پیداوار میں حیران کن ترقی کو بیروزگاری میں حیرت ناک اضافے نے مات دے دی ہے۔ یہ ایسی صورت میں ہوا جب یورپ نے آزاد بین الاقوامی تجارت کے لیے اپنی منڈی کو بتدریج کھولا۔ ہم اس نظام کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں جس کی وجہ سے بیروزگار افراد کی تعداد چار لاکھ بیس ہزار سے بڑھ کر اکاون لاکھ تک پہنچ جاتی اور وہ بھی ایسے عرصے میں جب معیشت اسی فیصد تک بڑھی ہو؟

آپ کو یہ بات باور کرنی چاہیے کہ ہم ملکوں کے درمیان معمول کے مقابلے کی بات نہیں کر رہے۔ وہ چار ارب افراد جو عالمی معیشت میں شامل ہو رہے ہیں، قطعی مختلف معاشرے بہت قطعی مختلف دنیا کا حصہ ہیں۔ یہ سمجھنا انتہائی نامعقولیت ہے کہ ہم اچانک آزاد عالمی، تجارت کا علاقہ قائم کر سکتے ہیں، جیسے اچانک چین کے ساتھ مشترکہ مارکیٹ قائم کر سکتے ہیں اور وہ بھی بغیر تبدیلیوں کے جن کے نتائج کے بارے میں ہم پیش گوئی نہیں کر سکتے۔

> ''ہم تائیوان، ہانگ کانگ، جنوبی کوریا اور سنگاپور کی طرح دوسرے ملکوں کو امیر کبیر بنانے کے لیے اپنی کامیابیوں کا اعادہ کیوں نہیں کر سکتے؟''

ان ملکوں کی سب ملا کر آبادی ساڑھے سات کروڑ افراد پر مشتمل ہے اس لیے مسئلہ کی نوعیت قطعی مختلف ہے۔ امریکہ میکسیکو میں اس قسم کی کامیابی حاصل کرنے کے قابل ہوسکتا ہے اور بتدریج مغربی یورپ بھی مشرقی یورپ میں ایسی کامیابی حاصل کر سکتا ہے لیکن بیک وقت چار ارب افراد کو اس میں شامل کرنا۔ ایک ایسا خواب ہی ہوسکتا ہے جسے کوئی بے بصیرت ہی شخص دیکھے گا۔

بہرحال جن ملکوں کا ذکر آیا ہے ان میں سے ہر ایک نے سرد جنگ سے فائدہ اٹھایا۔ اس عرصے کے دوران ایک یا دوسری بڑی طاقت دنیا کے ہر حصے کو اپنے کیمپ میں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شامل کرنے کے لیے کوشاں رہی۔ اگر ایک بڑی طاقت اس میں ناکام ہوتی تو دوسری بڑی طاقت اس کی جگہ لے لیتی یہی وجہ ہے کہ جنگ کوریا کے بعد مغرب، جنوبی کوریا، تائیوان، سنگاپور اور ہانگ کانگ کے ساتھ اقتصادی طور پر بہت اچھا سلوک کیا جبکہ چین کو ایک بڑا کمیونسٹ خطرہ سمجھا گیا۔

ان ملکوں کے لیے خصوصی اقتصادی رعایتوں اور ان کی اپنی سستی اور ہنرمند لیبر نے انہیں کامیاب کرایا۔ گزشتہ تین برسوں کے دوران ان ملکوں اور مغرب کے درمیان تجارتی توازن کی وجہ سے ہماری اربوں ڈالر کی دولت ان کے ہاں منتقل ہوئی ان ملکوں کو امیر بنانے کی خاطر مغرب اپنے ہاں ملازمتوں اور سرمائے کو تیزی کے ساتھ کم کرتا رہا۔

''آپ کیا تجویز کرتے ہیں؟''

ہمیں آزاد عالمی تجارت کے نظریہ کو مسترد کرنے سے آغاز کرنا چاہیے اور آزاد علاقائی تجارت کو اس کے متبادل کے طور پر آگے بڑھانا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی علاقہ باقی دنیا کے ساتھ تجارت نہیں کر سکے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر علاقہ یہ فیصلہ کرنے میں آزاد ہوگا کہ وہ دوسرے علاقوں کے ساتھ دوطرفہ معاہدے کرے یا نہ کرے۔ ہمیں یہ سوچے بغیر کسی ایک یا ہر قسم کی مصنوعات کے لیے اپنی مارکیٹ نہیں کھول دینی چاہیے کہ اس سے ہماری معیشت کو فائدہ ہوتا یا نہیں یا اسی سے روزگار تباہ ہوتا ہے یا ہمارا معاشرہ عدم استحکام کا شکار ہوتا ہے یا نہیں

''کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم دنیا کے دوسرے حصوں میں ہونے والی ایجادات واختراعات سے خود کو الگ تھلگ کر لیں؟''

نہیں۔ سرمائے کی نقل وحرکت کی آزادی کو برقرار رکھنا چاہیے۔ اگر کوئی جاپانی یا یورپی کمپنی اپنی مصنوعات شمالی امریکہ میں بیچنا چاہتی ہے تو اسے امریکہ میں سرمایہ کاری کرنی چاہیے۔ اسے اپنا سرمایہ اور اپنی ٹیکنالوجی ساتھ لانی چاہیے، امریکہ میں فیکٹریاں بنانی چاہئیں، امریکی لوگوں کو ملازم رکھنا چاہیے اور امریکہ کا سند یافتہ شہری بننا چاہیے۔ یہی بات ان امریکی اور جاپانی اداروں کے لیے بھی صحیح ہونی چاہیے جو یورپ میں اپنی مصنوعات فروخت کرنے کے خواہشمند ہیں۔

ذرا GATT کی تجاویز اور ان تجاویز کا جن کا ذکر میں نے کیا ہے، فرق دیکھئے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

GATT ترقی یافتہ ملکوں کے اداروں کے لیے لازمی قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی پیداوار بند کر دیں، اپنے ملازمین کی چھٹی کر دیں اور اپنی فیکٹریاں کم اجرت والے علاقوں میں لے جائیں۔ میں اس کے بالکل الٹ تجویز کر رہا ہوں۔ یعنی غیر ملکی کارپوریشنوں کو ہماری مارکیٹوں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے فیکٹریاں تعمیر کرنا ہوں گی، ہمارے لوگوں کو ملازم رکھنا ہو گا اور ہماری معیشت میں اپنا حصہ ادا کرنا ہو گا۔ یہ فرق ویسا ہی ہے جیسا زندگی اور موت میں ہوتا ہے۔

''لیکن کیا اس سے مقابلہ کم نہیں ہو جائے گا؟''

مقابلہ وہ معاشی اوزار ہوتا ہے جو کارکردگی کو بڑھانے، قیمتوں پر نیچے کی طرف دباؤ ڈالنے، جدت، رنگا رنگی پیدا کرنے اور انتخاب پر آمادہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سخت مقابلے کے لیے ایسی آزاد منڈی کی ضرورت ہوتی ہے جو بڑے ہوں اور جس میں مقابلہ کو روکنے کے لیے ایسوسی ایشنوں کی گروہ بندی اور مدمقابل قوتوں پر دوسری حدبندیاں ممنوع ہوتی ہیں۔ یورپ اور NAFTA اقتصادی طور پر دو آزاد تجارتی علاقے ہیں جن کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ بڑی، وسیع آزاد اور دنیا بھر سے آنے والی جدت کو اپنا لینے والی منڈیاں ہیں۔ دنیا بھر کی اہم کارپوریشن کو یہاں آ کر مقابلہ کرنا ہوتا ہے، اس لیے کہ کوئی کارپوریشن ان منڈیوں کو نظر انداز کرنے کی متحمل نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ ان کی منڈیاں بہت ہی بڑی اور بہت زیادہ خوشحال ہیں۔ لیکن اس قسم کا مقابلہ تعمیری ہو گا تباہ کن نہیں۔

''بہت سے لوگ آپ کو یہ جواب دیں گے کہ اگر آپ معیشت کو برقرار رکھتے ہیں تو پھر دوسرے علاقوں کو مال برآمد نہیں کر سکتے۔ اس سے شدید ردعمل پیدا ہو گا۔''

جاپان کو لیجئے۔ جاپانی برس ہا برس سے برآمد کر رہے ہیں اور اس دوران انہوں نے اپنی معیشت کو تحفظ مہیا کیا۔ بہرحال، دوطرفہ تجارتی معاہدوں سے مصنوعات کا تبادلہ اس طریقہ سے ممکن ہو جائے گا جو تمام فریقوں کے لیے مناسب ہو گا اور ہماری کارپوریشنیں دنیا بھر میں سرمایہ کاری کرنے اور مقابلہ کرنے میں آزاد ہوں گی۔

''آپ اور کیا سفارشات تجویز کرتے ہیں؟''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں خصوصی مہارت یعنی سپیشلائزیشن کے تصور کو مسترد کرتا ہوں۔ چند شعبوں میں خصوصی مہارت حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ باقی شعبوں کو چھوڑ دیا جائے۔ ہمارے قومی ورثے کا اہم ترین عنصر ہمارا موجودہ چھوٹے پیمانے اور درمیانے درجے کا کاروبار اور ہنرمند ہیں۔ صحت مند معیشت کو مخروطی انداز (اہرام) میں تعمیر کرنا چاہیے۔ چوٹی پر بڑی کارپوریشنیں ہوں، اس کی بنیاد میں چھوٹے ادارے ہوں۔ خصوصی مہارت کی چند کارپوریشنوں یک بنیاد پر قائم کی گئی معیشت بڑے منافع تو دے سکتی ہے لیکن چونکہ خصوصی مہارت کا مقصد پیداوار کو زیادہ بہتر بنانا ہوتا ہے اس لیے اس سے ملازمت کے مواقع نہیں نکلتے جو کہ مختلف النوع معیشت کے نتیجے میں نکلتے ہیں۔ صرف رنگا رنگ یا مختلف النوع معیشت ہی روزگار فراہم کرتی ہے جس سے لوگ معاشرے میں اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

ملک کی صورتحال پر تبصرہ کرنے والے ماہرین اقتصادیات کو پڑھنا غیر معمولی بات ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بڑی کارپوریشنوں کے منافع اور سٹاک مارکیٹوں کی حد یا ان کا درجہ معاشرے اور معیشت کی صحت کو جاننے کا معتبر ذریعہ ہیں۔ صحت مند معیشت شہریوں کے ایک بڑے حصے کو پیداواری عمل میں شریک کرتی ہے۔

> ”برطانوی لوگوں کو ان تصورات کی طرف مائل کرنے میں آپ کو کافی دشواری ہوتی ہے۔ آزاد تجارت پر غیر مشروط یقین کی ایک طویل روایت وہاں موجود ہے جسے برطانوی لوگ مشکل ہی سے چھوڑیں گے۔“

آزادتجارت پر برطانوی لوگوں کے اعتماد اور یقین کی بنیاد انیسویں صدی کے آغاز میں رکھی گئی تھی۔ یہ برطانیہ ہی تھا جس میں اس وقت صنعتی انقلاب نے جنم لیا تھا۔ نئے صنعتی امراء کو، جن کی قوت برطانوی محنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی، اپنے کارخانوں کو آباد کرنے کے لیے زیادہ اور سستی لیبر کی ضرورت تھی۔ خیال یہ تھا کہ نوآبادیوں سے سستی خوراک درآمد کرنے سے برطانوی زراعت اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ اس کے نتیجے میں کھیتوں میں کام کرنے والے ضرور شہروں کا رخ کریں گے۔ اس وقت برطانیہ کی اسی فیصد آبادی شہری علاقوں سے باہر رہتی ہے۔ ایک دفعہ جو کسان روزگار سے محروم ہو کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شہروں میں پہنچ جاتے ہیں، انہیں کم اجرت پر ملازم رکھ لیا جاتا ہے اس لیے کہ نو آبادیوں سے سستی خوراک مہیا ہو جاتی تھی۔ مزید برآں جو برطانوی دولت سستی خوراک خریدنے کے لیے باہر جاتی تھی وہ دوبارہ تیار شدہ اشیاء کی خرید کے لیے واپس برطانیہ پہنچ جاتی تھی۔ اس وقت مینوفیکچرنگ میں برطانیہ کی اجارہ داری تھی۔ یہ وہ حالات تھے جن کی وجہ سے 1846ء کے کارن لاز کو ختم کرنا پڑا جن کے تحت برطانوی زراعت کو تحفظ حاصل تھا۔

آج حالات اس سے قطعی الٹ ہیں۔ آج برطانیہ کے محنت کشوں کی آبادی کا صرف 1.1 فیصد زراعت سے منسلک ہے۔ شہروں میں لیبر کی ضرورت نہیں بلکہ نہ ختم ہونے والی بیروزگاری ہے اور جو دولت درآمدات کے لیے برطانیہ سے باہر جاتی ہے، اب وہ برطانوی مصنوعات کی خرید کے لیے واپس برطانیہ میں نہیں آتی۔ وہ جاپان یا کوریا یا دنیا کے کسی دوسرے ملک میں چلتی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت برطانیہ مصنوعات میں تجارتی خسارے کا شکار ہے۔ باوجود اس کے کہ کچھ بڑی کمپنیاں اچھے منافع کماتی ہیں، 25 فیصد لوگ اور ہر تیسرا بچہ غربت و افلاس کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جیسے معیشی سوچ میں سب سے بڑا مغالطہ یہ ہے کہ تجارت میں منفی توازن یا سرمائے کے باہر نکل جانے کی وجہ سے فنڈ ملک سے باہر چلے جاتے ہیں، وہ خود بخود واپس آ جائیں گے۔ بہت سے ماہرین یہ کہتے ہیں کہ مثال کے طور پر اگر ایشیائی ممالک درآمد سے زیادہ برآمد کریں گے تو زائد رقم بیرون ملک لگائی جائے گی اور آخر کار اس سرمایہ کاری سے وہ کمی پوری ہو جائے گی جو سرمایہ باہر جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کے اس مفروضہ کی بنیاد اس ریاضیاتی کلئے پر ہوتی ہے کہ کسی بھی ملک کے حساب کتاب میں توازن ہونا چاہئے لیکن جب کوئی دوسرا ملک اپنی زائد یا اضافی رقم خسارہ برداشت کرنے والے ملک کو دیتا ہے تو عمومی طور پر یہ رقم اثاثوں میں سرمایہ کاری یا فکسڈ منافع والے قرض کی صورت میں واپس ہوتی ہے۔ وہ اثاثے غیر ملکی مالک کی ملکیت بن جاتے ہیں اور ان سے ہونی والی کمائی اسی مالک کو جاتی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے پوکر کے کھیل کو لیجئے۔ فرض کریں کہ آپ کے پاس جو رقم ہے اس سے کہیں زیادہ رقم اس کھیل میں ہار جاتے ہیں تو نقد ادائیگی کی بجائے آپ اپنے گھر کی ملکیت مدمقابل کے حوالے کر دیتے ہیں اور آپ اس گھر میں کرائے دار کے طور پر رہتے ہیں۔ کیا ہم سنجیدگی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے لین دین کے نتائج ہماری مالی حالت پر کچھ اثر انداز نہیں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوں گے؟"

امریکہ نے اب اسی مسئلہ کا سامنا شروع کر دیتا ہے۔ "دی اکانومسٹ" لکھتا ہے۔ "1981ء کے بعد امریکہ دنیا کے سب سے بڑے لین دار کی حیثیت سے آ کر سب سے بڑے مقروض کی سطح پر پہنچ چکا ہے۔ اور اس کی وجہ جاری اکاؤنٹس میں مسلسل خسارہ ہے۔ 1993ء کے آخر میں امریکہ 556 بلین ڈالر کے غیر ملکی قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔" واشنگٹن پوسٹ اپنے اداریے میں لکھتا ہے "اب امریکی معیشت نے اندرون ملک غیر ملکی سرمایہ کاری پر ہونے والی آمدنی کو دوسرے ممالک میں امریکی سرمایہ کاری پر ہونے والی آمدنی کی نسبت ملک میں جمع ہوتے ہوئے غیر ملکی قرضوں پر زیادہ خرچ کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ وہ لاگت ہے جو سال بہ سال ان بڑے تجارتی خساروں پر اٹھ جاتی ہے۔ ان میں سرمایہ کاری غیر ملکی سرمائے سے کی جاتی ہے اور کسی بھی مقروض ملک کی طرح امریکہ کو رقم کے استعمال پر ادائیگی کرنا پڑتی ہے۔ یاد رہے کہ امریکی معیشت، اب غیر ملکوں سے قرض مانگ کر اپنے پہلے والے غیر ملکی قرضوں پر سود ادا کرتی ہے۔ یہ بات کسی بھی ملک کے لیے مفید نہیں اور نہ ہی کسی کاروبار کے لیے مفید ہے اور پھر یہ کہاں تک ممکن ہے کہ اس طرح رہا جائے اور اس وقت تک رہا جائے جب تک غیر ملکی قرض دیتے رہیں۔ جب بھی ان کی مرضی ہوگی سود کی شرح میں اضافہ ہو جائے گا۔ کیا ایسا ہونا چاہیے؟ امریکیوں کو اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھالنا ہوگا اور جیسا کہ لاطینی امریکہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اس کا واضح مطلب معیار زندگی میں کمی ہے۔ غیر ملکی خسارے جتنے بڑھیں گے، اتنا ہی حالات کے مطابق ڈھالنا مشکل ہوگا۔"

بہر حال جو ممالک فنڈز وصول کرتے ہیں، وہ انہیں دنیا میں کسی بھی جگہ لگانے میں آزاد ہیں اور وہ وہیں سرمایہ لگائیں گے جہاں سے انہیں زیادہ سے زیادہ منافع کی توقع ہوگی۔ وہ ان ممالک میں تو سرمایہ نہیں لگائیں گے جو موت کی طرف بڑھ رہے ہوں۔

اگر ایک نظام خاص قسم کے حالات میں چل سکتا ہے، تو یہ ممکن نہیں کہ وہی نظام دوسرے مختلف قسم کے حالات میں بھی چل پائے گا۔ امید کی جا سکتی ہے کہ یہ سوچ برطانیہ کے سیاسی معززین کو مجبور کرے گی کہ وہ کھلے ذہن کے ساتھ اپنے اقتصادی نظریے پر نظر ثانی کریں۔ لگتا ہے کہ ہم معیشت کے مقصد کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ موجودہ برطانوی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حکومت کو اس بات پر فخر ہے کہ دوسرے یورپی ممالک کی نسبت برطانیہ میں لیبر سستی ہے لیکن وہ یہ نہیں سمجھ پائی کہ آزاد عالمی تجارت کے نظام میں اس کے مدمقابل یورپی ممالک نہیں بلکہ کم لاگت والے ممالک ہوں گے۔ برطانوی حکومت اپنے عوام کو کتنا ہی غریب کرنے کا فیصلہ کرلے ان ممالک کی لیبر کے مقابلے میں برطانیہ کی لیبر پھر بھی ہمسری کے بغیر ہی رہے گی۔

امریکہ کے خوشگوار دنوں میں ہنری فورڈ نے کہا کہ وہ اپنے ملازمین کو زیادہ اجرتیں دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کے گاہک بن جائیں اور ان کی کاریں خریدیں۔ آج ہمیں فخر ہے کہ ہم کم اجرتیں دیتے ہیں۔ ہم بھول چکے ہیں کہ معیشت معاشرے کی ضروریات پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ معیشت کا آخری مقصد یہ ہے کہ ایسی خوشحالی کرے جو مستحکم ہو۔

''استحکام سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

استحکام کا مطلب جمود یا ساکت رہنا نہیں ہے۔ مستحکم معاشرہ سماجی توڑ پھوڑ کے بغیر ضروری تبدیلی کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ مستحکم معاشرے کو ذمہ دارانہ اقتصادی ترقی سے ہی فائدہ پہنچتا ہے۔

''جرمنی کے معززین کی طرف سے بین الاقوامیت کی حمایت کے پیش نظر علاقائی تجارت کی خوبیوں کے بارے میں آپ جرمنی کو کیسے قائل کریں گے؟''

جرمنوں کو یہ جاننا چاہیے کہ ان کے زیادہ تر خریدار ان کے ہمسائے ہیں۔ جرمنی کی 70 فیصد برآمدات یورپ ہی میں فروخت ہوتی ہیں۔ جرمنی کبھی نہیں چاہے گا کہ ملازمتوں اور سرمائے کے مفلوج ہونے کے نتیجے میں اس کے بنیادی خریدار کنگال ہو جائیں۔ جرمنی کی خوشحالی کا انحصار یورپ کے دوسرے ملکوں کی خوشحالی پر ہے۔ جرمنی کے سماجی استحکام پر اس کے ہمسایہ ملکوں کے سماجی استحکام کے گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔ چاہے وہ صنعتی میدان میں کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو، دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح جرمنی کو بھی کم لاگت والے علاقوں میں پیداوار کی منتقلی سے شدید دھچکا لگنے لگا۔ مزید برآں GATT کے تحت جرمنی کو باقی ماندہ منڈیوں میں جاپان، کوریا اور دوسرے ملکوں کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

درآمدات کے ساتھ حصہ دار بننا پڑے گا۔

''آپ کے نزدیک علاقائی آزاد تجارت کے اثرات کا خلاصہ کیا ہے؟''

آیئے تصور کر لیتے ہیں کہ یورپ معاہدہ روم کے بنیادی خیال کی طرف واپس آ گیا ہے، جو یورپی کمیونٹی کی تخلیق کی بنیاد تھا۔ اقتصادی طور پر اس کا مقصد دنیا میں سب سے بڑی آزاد منڈی قائم کرنا تھا۔ یورپ میں نہ تو کوئی محصول ہوگا، نہ ہی رکاوٹیں ہوں گی بلکہ یہاں ایک آزاد اور مقابلے والی منڈی ہوگی۔ یورپ سے باہر کے ممالک کے ساتھ تجارت خاص شرح میں ہوگی۔ یہ تصور شراکتی ترجیح یا فوقیت کے طور پر مشہور ہوا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے یورپی ملازمتوں اور صنعت کو ترجیح دی جائے گی۔ بیس سال قبل، یورپ کو چلانے والے ٹیکنوکریٹس نے خاموشی کے ساتھ اس بنیادی اصول میں تبدیلی کرنا شروع کر دی اور وہ بتدریج عالمی آزاد تجارت کی طرف بڑھنے لگے۔ اس وقت سے مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ کے باوجود یورپ میں بیروزگاری میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ''معاہدہ ماسٹرک'' اس تبدیلی کو تحفظ مہیا کرتا اور عالمی آزاد تجارت کو وہ بنیادی اصول قرار دیتا ہے جس پر نئے یورپ کو تعمیر ہونا ہے۔

اگر ہمیں اپنے آباؤ اجداد کے تصورات کی طرف واپس جانا ہے اور شراکتی فوقیت کو دوبارہ نافذ کرنا ہے تو پھر ان تمام اداروں کو واپس آنا ہوگا جنہوں نے اپنی پیداوار کو کم لاگت والے ممالک میں منتقل کر دیا ہے۔ پھر وہ یورپ کے باہر تیار ہونے والی مصنوعات کو درآمد نہیں کر سکیں گے۔ فیکٹریاں تعمیر کرنی ہوں گی، یورپی افراد کو ملازم رکھنا ہوگا اور یوں معیشت بہتر ہوگی اور سماجی استحکام واپس آئے گا۔ مزید برآں ان کارپوریشنوں کو، جو اپنی مصنوعات یورپ میں فروخت کرنے کی خواہشمند ہوں گی، کارخانے لگانے ہوں گے، یورپی لوگوں کو ملازم رکھنا ہوگا اور یورپی معیشت میں سرگرمی کے ساتھ اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ اس وقت جو معاشرہ موت کی دہلیز پر کھڑا ہے، اچانک زندہ ہو جائے گا اور پھر یہ معاشرہ یعنی یورپی معاشرہ ایسی جگہ ہوگا جہاں ہر ایک سرمایہ کاری کے لیے بے چین ہوگا اور یورپی کارپوریشنیں دنیا بھر کے علاقوں میں سرمایہ کاری کر کے انہیں خوشحال بنا سکیں گی۔ شمالی امریکہ کے بارے میں بھی یہی حقیقت ہے۔

جہاں تک ترقی پذیر معیشتوں والے علاقوں کا تعلق ہے تو وہ بھی خوشحال ہوں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گے۔ مثال کے طور پر ان دنوں لاطینی امریکہ اور جنوب مشرقی ایشیاء میں آزاد تجارتی علاقے قائم کئے جا رہے ہیں۔ شمالی امریکہ، یورپ اور جاپان کی بہت سی کارپوریشنیں اپنی مصنوعات ان بڑی منڈیوں میں پہنچانے کے خواہشمند ہوں گی۔ ایسا کرنے کے لیے انہیں لاطینی امریکہ اور جنوب مشرقی ایشیاء میں سرمایہ اور ٹیکنالوجی منتقل کرنا ہوگی، فیکٹریاں قائم کرنا ہوں گی اور وہاں کے مقامی لوگوں کو روزگار مہیا کرنا ہوگا۔ ان معیشتوں میں اپنا کردار ادا کر کے وہ وہاں ترقی کی حوصلہ افزائی کریں گی۔

GATT کو ہر صورت میں مسترد کیا جانا چاہیے۔ یہ بہتر نظام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ ادارہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کو جو نقصان پہنچائے گا وہ ناقابل برداشت ہوگا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب 3

اقوام، مصنوعی ریاستیں اور گنجان آباد مقامات

''اس وقت پوری دنیا میں تقریباً تیس جنگیں لڑی جا رہی ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد تصادم میں اضافہ کیوں ہوا ہے؟''

ان میں سے زیادہ تر جھگڑوں کے اسباب نسبتاً معمولی نوعیت کے ہیں۔ ان میں سے بہت سے جھگڑے کسی غیر ملکی جارحیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اصل قوموں پر مسلط کی جانے والی مصنوعی ریاستوں سے آزادی کی خواہش کا نتیجہ ہیں۔

بہت سی مصنوعی ریاستیں اس وقت وجود میں آئیں جب مغرب کے معزز حکمرانوں نے غلط بنیادوں پر دنیا کے نقشہ میں تبدیلیاں کیں۔ روایتی دانائی نے جس پر انحصار کرتے ہوئے انہوں نے ایسا کیا، قوم کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اس لیے وہ قوموں، مصنوعی ریاستوں اور گنجان آباد جگہوں میں تمیز نہ کر سکے۔ سرد جنگ کے دوران بڑی طاقتوں نے تکلیف دہ اور پریشان کن عالمی نظام کے ذریعے غیر فطری سیاسی ڈھانچوں کو ان کی جگہ قائم رکھا۔ اب قومیں اپنی آزادی واپس حاصل کرنا چاہتی ہیں چنانچہ اس کا فطری نتیجہ تصادم ہے۔ یہ زمین ہی ہوتی ہے جہاں کے شہری اپنی بھرپور اکثریت کے باعث ایک مشترکہ تہذیب، تشخص، ورثہ اور روایتی اساس میں شراکت دار ہوتے ہیں۔

''آپ قوم میں اور جسے آپ مصنوعی ریاست کہتے ہیں، میں کیسے فرق کریں گے؟ اس سلسلے میں مجھے کچھ مثالیں دیجیے۔''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چیک اور سلوواک وہ قومیں ہیں جنہیں 1918ء میں طاقت کے ذریعے ایک واحد ریاست چیکوسلاویکہ بنا دیا گیا۔ دیوار برلن کے گرنے کے بعد جونہی وہ آزاد ہوئے، انہوں نے اپنی مصنوعی یونین یا اپنے مصنوعی اشتراک کو ختم کر دیا اور پرامن طریقے سے الگ ہو گئے۔ یوگوسلاویہ بھی ایک مصنوعی ریاست تھی جو 1918ء ہی میں وجود میں لائی گئی۔ یہ ریاست سربوں، کروٹ، سلوونز اور چھ دوسری قوموں پر مشتمل تھی اس میں چھ ری پبلکس اور دو خودمختار علاقے تھے۔ ان سب پر سربوں کی طاقت کا غلبہ تھا۔ موجودہ جنگ ان مختلف قوموں کی آزادی کی خواہش کا مظہر ہے۔ لیکن زیادہ علاقہ حاصل کرنے کی خواہش نے اسے پیچیدہ بنا دیا ہے۔

بلجیم کی مصنوعی ریاست 1831ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس کے ذریعے ویلون اور فلیمش لوگوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی گئی۔ 162 سالہ تصادم کے بعد 1993ء میں آئین میں اس طرح تبدیلی کی گئی کہ اس میں موجود تمام قوموں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری حاصل ہو گی۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ موثر علیحدگی کی طرف یہ پہلا قدم ہے۔

میں نے جن تین ریاستوں کی مثالیں دی ہیں، ان میں سے دو مصنوعی ریاستیں پرامن طور پر بکھر گئی ہیں۔ چیکوسلواکیہ مذاکرات کے ذریعے اور بلجیم آئین تبدیلیوں کے ذریعے۔ جبکہ تیسری ریاست یوگوسلاویہ میں جنگ شروع ہو چکی ہے اور وہاں ایک بہت بڑا المیہ جنم لے چکا ہے۔

یہ عمل پوری دنیا میں جاری ہے۔ اس کی ایک مثال تو کینیڈا میں چلنے والی علیحدگی کی تحریک ہے۔ یورپ میں اٹلی کو لیجئے۔ وہاں کی سیاسی جماعت لمبارڈے لیگ علیحدگی پسند پارٹی کے طور پرا بھر رہی ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی تحریکیں ہیں جو عمومی طور پر ہوتی ہیں۔ باسک علیحدگی پسند اور کرد جو بہت سے ملکوں میں تقسیم ہیں، خود کو یکجا کر کے اپنی علیحدہ شناخت کے لیے لڑ رہے ہیں۔

سابقہ سوویت یونین کو دیکھ لیجئے۔ جہاں قوم پرستی کو دبایا گیا۔ تو کیا صورت سامنے آئی۔ ''آرمینیا''، ''جارجیا''، مالدووا'' اور ''تاجکستان'' اس کی مثالیں ہیں۔ افریقہ میں صورت حال سب سے زیادہ گمبھیر ہے۔ اس براعظم کو نوآبادیاتی طاقتوں نے بہت نقصان پہنچایا وہاں مختلف قوموں کے آبائی علاقوں میں سرحدیں قائم کر کے براعظم کو تباہ و

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ مثال کے طور پر صومالیہ کے درمیان سرحد کھینچ دی گئی اور اس طرح صومالی عوام کی ایک بڑی تعداد کو کینیا کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ سائی قوم کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا گیا۔ انہیں کینیا اور تنزانیہ میں تقسیم کر دیا گیا۔ دوسری جگہوں پر بھی ہم نے مصنوعی ریاستیں قائم کیں۔ نائجیریا چار بڑی قوموں ہاؤسا، گیو، یوڑوبا اور فولانی پر مشتمل ہے۔ یہ ملک خوفناک جنگ کی وجہ سے بہت نقصان اٹھا چکا ہے۔ یہاں لاکھوں افراد قتل ہوئے، اس کے باوجود کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ سوڈان، چاڈ، جبوتی، سینگال، مالی، برونڈی اور روانڈا ان بہت سی ریاستوں میں سے چند ایک ہیں جہاں تصادم اور جنگوں نے سب کچھ تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

ہماری موجودہ پالیسی بھی کچھ بہتر نہیں ہے۔ نسل پرست حکومت کے خاتمہ کے بعد بھی ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جنوبی افریقہ ایک ایسی مصنوعی ریاست ہے جو متعدد بڑی اور باوقار و ذی شان سیاہ فام قوموں پر مشتمل ہے۔ انہیں سفید نوآبادیاتی طاقت نے غلام بنائے رکھا لیکن اب وہ خودمختاری چاہتے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح مغرب کی پالیسی اپنی روح میں نوآبادیاتی ہی ہے، اس لیے ہم یہ سمجھنے سے انکار کر دیتے ہیں کہ اب وہاں بنیادی مسئلہ سیاہ فاموں اور سفید فاموں کے درمیان نہیں بلکہ ان قوموں کے درمیان ہے، جنہیں زبردستی یکجا کر دیا ہے۔ چنانچہ ہمارے رہنما ایک استعماری ڈھانچہ کی جگہ دوسرا استعماری ڈھانچہ لا کر اپنے شاہانہ ڈھانچے کو قائم رکھنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ وہ ذہوسا قوم کی حمایت کرتے ہیں تاکہ وہ دوسروں پر غلبہ قائم کرے۔ ہم وہاں ایک اور یوگوسلاویہ بنانے کی کوششیں دیکھ رہے ہیں۔ نوآبادیاتی حس واپس آئی۔ ہم نے یہ یقین کرنا شروع کر دیا کہ صومالیہ کے مسئلے کا حل ہم جانتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے ''امید قائم کرنے کے آپریشن'' کو ''قوم کی تعمیر'' کے لیے فوجی مہم میں تبدیل کر دیا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ صومالیہ میں امریکی سفیر کی زبانی سنئے۔ اس کا کہنا ہے کہ ''اب صومالیہ نہیں رہا۔ صومالیہ ختم ہو چکا ہے۔ آپ اس جگہ کو جہاں صومالی عوام رہتے ہیں، صومالیہ کہہ سکتے ہیں لیکن اس ریاست کی حیثیت سے صومالیہ 1991ء میں ختم ہو چکا ہے۔'' جی ہاں یہی سال تھا جب امریکی قیادت میں وہاں فوجی کارروائی کی گئی، جس کی وجہ سے صومالیہ افراتفری اور انتشار کا شکار ہو گیا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہماری طرف سے مسلط کئے گئے المیہ اور انتشار اور اپنے مسائل حل کرنے میں ناکام ہونے کے باوجود ہم اب

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی یہی سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس علم ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم دوسری قوموں کو غلام بنائے رکھیں اور ان پر اپنے خیالات ٹھونستے رہیں۔

''آپ کا یہ مطلب تو نہیں کہ کوئی قوم غیر ملکیوں کو اپنا حصہ نہیں بنا سکتی؟''

بالکل نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قوموں کو نئے خون اور نئے خیالات کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ایک وقت میں وہ محدود خون اور خیالات ہی کو جذب کر سکتی ہے۔ کوئی قوم اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی کہ نقل مکانی کے ذریعے اسے اقلیت بنا دیا جائے۔ اس لئے کہ اس طرح وہ اپنی شناخت کھو دے گی اور اپنی علیحدہ قوم کی حیثیت گنوا بیٹھے گی۔ نئے آنے والے جن کی کسی قوم میں پذیرائی کی جاتی ہے انہیں چاہیے کہ وہ نئے ملک کے رسوم و رواج کا احترام کریں۔ انہیں یہ نہیں چاہیے کہ وہ کسی ملک میں آتے ہی وہاں کے قومی کلچر کو مسترد کر دیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو پھر اس کا فطری نتیجہ عداوت، عدم رواداری اور تصادم ہوگا۔

''جسے آپ گنجان آباد جگہ یا علاقہ کہتے ہیں، قوم میں اور اس میں کیسا فرق ہے؟''

بہت سے جدید دانشوروں نے یہ پڑھایا ہے کہ ایک جغرافیائی علاقہ، جب اس میں آبادی ہو جائے تو اپنی اس وجہ سے ایک قوم بن جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان دانشوروں کے خیال کے مطابق مختلف تہذیبوں اور مختلف لسانی گروہوں کے لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے اور انہیں ایک دوسرے سے ملا جلا کر ایک مخصوص علاقے میں رکھ کر ایک قوم تخلیق کی جا سکتی ہے۔ حقیقت میں اس عمل سے صرف کسی جگہ کو آباد کیا جا سکتا ہے جو شاید ایک طویل مدت گزرنے کے بعد ایک قوم بن جائے۔

''مذہبی جنگوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

حال ہی میں مذہبی جنگوں میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی بڑی وجہ اسلام کا استحکام ہے لیکن یہ بذات خود مغربی جدیدیت کی بہت زیادہ مداخلت کا فطری ردعمل ہے۔

مثال کے طور پر ایران میں شاہ نے قلیل مدت میں اپنے ملک کو مغربیت کا جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ اس نے اجتماعی کاشتکاری کا نظام متعارف کروایا، دیہی آبادی کو اس کی جگہ سے اکھاڑا اور شہروں کی طرف دھکیل دیا جہاں کی پسماندہ آبادیوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اس نے تیز رفتاری کے ساتھ صنعتکاری کا پروگرام دیا اور اپنے ہاں کے روایتی رسم و

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رواج کی جگہ مغربی کلچر کو رواج دینے کی کوشش کی۔ مزید برآں اس نے اپنے ہاں کے عوام کے مذہب کو چیلنج کر دیا۔ قوم یہ سب کچھ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے اور جب عمل کو بہت زیادہ بڑھا دیا جائے تو پھر اس کا ردعمل بہت ہی مضبوط اور سخت ہوتا ہے۔ الجزائر، دوسرا ملک ہے جو اس وقت سخت تکلیف میں ہے۔ یہاں بھی مغرب نے اپنا کلچر مسلط کرنے اور آباؤ اجداد کی روایات کی جگہ مغرب کے ترقی پسند سوشلزم (جسے فیشن ایبل دانشور بہت پسند کرتے ہیں) کو مسلط کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیہی آبادی بے گھر ہو گئی، نسبتاً کم کامیاب صنعتکاری ہوئی، شہروں کی آبادی کی بڑے پیمانے پر منتقلی ہوئی اور یوں شہریوں میں گندی آبادیاں وجود میں آ گئیں۔ غیر مستحکم آبادی کو خاموش کرنے کے لیے فلاحی کام کئے گئے جس کی وجہ سے دوسروں پر انحصار کرنے والا طبقہ وجود میں آیا۔ آبادی میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا۔ سماجی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ گیا، جرائم کی شرح میں بے پناہ اضافہ ہوا اور آخر کار تباہ کن غیر ملکی کلچر کو مسترد کر دیا گیا، جو ان پر ٹھونسا گیا تھا۔

ہیٹی میں جمہوری انتخاب کے بعد برٹینڈ اریسٹاج کی بے دخلی پھر بحالی اور الجزائر کے انتخابات میں اسلامی سیاسی جماعتوں کو ممکنہ کامیابی کے پیش نظر انتخابات کو روک دینے پر مغربی ملکوں کے ردعمل کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔ جہاں تک ہیٹی کا تعلق ہے تو وہاں ٹی وی کیمروں کے سامنے فوجیوں اور سیاستدانوں کو یہ کہتے دکھایا گیا کہ جمہوری انتخابات کو پوری دنیا میں احترام کی نظر سے دیکھا جانا چاہیے لیکن الجزائر کے جمہوری انتخاب کے بارے میں بالکل دوسرا رویہ اختیار کیا گیا۔ دراصل مغرب جمہوری ذرائع سے اپنے نظریات کی مخالفت برداشت نہیں کر سکتا۔ اسے وہ پاگل پن قرار دیتا ہے۔

''آپ اس کی وضاحت کریں گے؟''

مغرب کا خیال ہے کہ اس کا مقدر ہے کہ وہ مختلف النوع انسانی تہذیبوں کی رہنمائی کرے یا انہیں جبراً ایک عالمی تہذیب میں ڈھالے۔ اس کی بڑی وجہ مغرب کا یہ یقین ہے کہ اس نے ہی ایک ماڈل سوسائٹی دریافت کی ہے جو انسانیت کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ اس لیے اس بات کو یقینی بنانا اس کا فرض ہے کہ پوری دنیا اس ماڈل کو اپنائے۔ ہیٹی سے متعلق بحث اس خیال کا بہترین تصور ہے۔ کلنٹن انتظامیہ کے مشیروں کی تجویز ہے کہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جمہوریت کا حق عالمی ہونا چاہیے اور تمام ممالک قانونی استحقاق کے طور پر اس کی ضمانت دیں۔ نتیجتاً امریکی انتظامیہ نے ہیٹی میں فوجی مداخلت کی۔ جین کرک پیٹرک نے لکھا ہے ''اگر ہم ہیٹی کے خلاف اقدام کرتے ہیں تو ہمیں یہ سمجھ کر ایسا کرنا چاہئے کہ پچپن ممالک ایسے ہیں جن کے بارے میں ''فریڈم ہاؤس'' کہہ چکا ہے کہ وہ ''آزاد'' نہیں ہیں۔

ثقافتی امپریلزم کی اس شکل کو بین الاقوامی کاروبار کے ذریعے مزید استحکام دیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے سماجی رنگا رنگی کی تباہی اور اس کے متبادل عالمی یک رنگی کلچر سے اسے فاۂ پہنچے گا۔

''امریکہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ ایک قوم ہے، مصنوعی ریاست ہے یا گنجان آباد جگہ ہے؟''

امریکہ نے اپنے تاریخی سفر میں کئی مرتبہ راستہ بدلا ہے۔ اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں یہاں منتقل ہوئے والی آبادی بنیادی طور پر یورپ کی ثقافتی روایات کی حامل تھی۔ اس کے بعد غلاموں کی درآمد کا ہولناک المیہ ظہور پذیر ہوا۔

جیمز میڈیسن نے صدارت سے ریٹائر ہونے کے بعد اس تبدیلی کے سماجی نتائج کو پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اگرچہ خود اس کے پاس بھی غلام تھے، اس کے باوجود وہ غلاموں کی آزادی پر یقین رکھتا تھا۔ وہ یہ جان گیا تھا کہ غلاموں سے ان کا کلچر اور تشخص چھین لئے گئے ہیں اور یہ کہ انہیں سفید فاموں کے کلچر سے الگ رکھا جائے گا تو وہ اسے مسترد کر دیں گے۔ اس کا کہنا تھا کہ پھر سماجی زخموں کو مندمل کرنا تقریبا ناممکن ہوگا۔ سیاہ فام لوگوں کی اکثریت علیحدہ رہے گی اور امریکہ کے سماج سے الگ تھلگ ہو کر زندگی گزارے گی جبکہ سفید فام باشندوں میں جرم کا احساس برقرار رہے گا۔ دونوں گروہ کبھی ایک قوم کے طور پر اکٹھے نہیں ہوسکیں گے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ میڈیسن اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ آزادی کے بعد غلاموں کو واپس افریقہ چلے جانا چاہیے اور امریکہ کو سیاہ فاموں کی اس منتقلی میں زیادہ سے زیادہ مدد کرنی چاہیے۔ وہ میڈیسن امریکن کالونائزیشن سوسائٹی کا اساسی رکن تھا جو اسی مقصد کے لیے قائم کی گئی تھی۔

''میڈیسن کی نصیحت پر کیسا ردعمل ہوا؟''

1822ء میں امریکہ نے لائبیریا کا علاقہ حاصل کیا تا کہ سابقہ غلاموں کو وہاں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھیجا جا سکے۔ لفظ لائبیریا غلاموں کی آزادی کی علامت تھا اور ملک کا موٹو یہ ہو گیا ’’ہم آزادی کی خاطر یہاں آئے‘‘۔ بدقسمتی سے (جیسا کہ ہر معاملے میں ایسا ہی ہوا) وطن کی ضرورت ان لوگوں کے حقوق پر حاوی ہوگئی جو پہلے سے وہاں آباد تھے اور ان کے ملک کی فروخت میں ان کی رائے تک نہیں لی گئی تھی۔ افسوس اس تجربے کے نتائج غیر متوقع طور پر الٹ نکلے۔ آزاد ہونے والے غلاموں نے مقامی لوگوں کو غلام بنانا شروع کر دیا۔ 1930ء میں لیگ آف نیشنز نے لائبیریا کی مذمت کی کہ وہاں پر غلامی کی صورت انتہائی کریہہ تھی۔ گزشتہ دہائیوں کے دوران لائبیریا میں جو خانہ جنگیاں ہوئیں ان کی ایک ہی بنیادی وجہ ہے اور وہ یہ کہ مقامی باشندوں نے اپنے ملک پر کنٹرول دوبارہ حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

’’آپ کے خیال میں افریقیوں کے جبری ترک وطن نے امریکہ پر کیا نقوش مرتب کیے؟‘‘

جیمز میڈیسن نے جو نتائج اخذ کئے تھے، میں ان سے متفق ہوں۔ آپ شدید ردعمل پیدا کئے بغیر لوگوں کو ان کے کلچر، ورثے اور تشخص سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ افریقیوں کے امریکہ میں آنے سے پہلے امریکہ کو نقل وطن کرنے والی آبادی ایک قوم بنتی ہوئی نظر آتی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے امریکہ آئے تھے اور ایک آزاد اور غیر طبقاتی معاشرے کے تصور سے متاثر تھے۔ انہوں نے اپنے طور پر اپنے ورثہ کو چھوڑنے اور اپنی بنیادوں کے ساتھ اپنا تعلق ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ آسانی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے۔ بہرحال چند استثنا بھی تھیں۔ کچھ گروہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ شادیاں کیں۔ لیکن جنوب کے سفید فام امریکیوں کو فخر ہے کہ ان کے آباؤ اجداد جرمن، اینگلوسیکسن، سکاٹش اور آئرش تھے۔ 1820ء اور 1860ء کے درمیان دس یورپی تارکین وطن میں سے تو انگلستان، آئرلینڈ یا جرمنی سے آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ میڈیسن نے جن دلائل کی پیش بینی کی تھی وہ صحیح نکلی اور افریقی اور یورپی امریکیوں کے درمیان رشتہ خاصا تکلیف دہ رہا۔

1965ء تبدیلی کا سال ثابت ہوا۔ یہی وہ سال تھا جب امیگریشن اینڈ نیشنلٹی ایکٹ میں ترامیم منظور ہوئیں۔ ان ترامیم نے اس پالیسی کا خاتمہ کر دیا جس کے تحت ماضی میں تارکین وطن کے لیے امریکہ میں موجود ثقافتی انداز کا خیال رکھا جاتا تھا۔ یہ قانون ایک انقلابی قدم تھا کیونکہ یورپیوں کے ترک وطن کی حمایت جاری رکھنے کی بجائے امریکہ نے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اپنے تئیں خود آزاد دنیا بننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس صدی کے پانچویں دہائی کے دوران امریکہ میں یورپی تارکین وطن کی تعداد ایشیائیوں کے مقابلے میں نو گناہ زیادہ ہو گئی تھی۔ نئے امیگریشن ایکٹ کی منظوری کے بعد یہ تناسب تیزی کے ساتھ الٹ ہو گیا۔ 1990ء تک یورپ کے تارکین وطن کی کل تعداد آدھی رہ گئی۔ جبکہ دوسرے براعظموں اور ثقافتی اکائیوں کے تارکین وطن کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ اپنے دروازے، آزادی کے لیے خواہشمندوں کے لیے جن کا تعلق چاہے کسی بھی جگہ سے ہو، کھول کر امریکہ نے نئے انداز کی پالیسی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ صدر ریگن نے 1982ء میں نئے سال کی اپنی مشہور تقریر میں امریکہ کا ذکر اس طرح کیا کہ ''ہم ایسی قوم ہیں جو دنیا کے ہر کونے سے آنے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ ہر قسم کی نسل اور ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔''

اس نقطہ نظر کو خوب سراہا گیا۔ یہ پالیسی نہ صرف اپنی روح میں فیاضیانہ تھی بلکہ ایسا لگتا تھا جیسے اب ایک ایسی ذہین، طاقتور اور محنتی نسل وجود میں آئے گی جو امریکہ کو عظیم تر بنانے میں ممد ثابت ہو گی۔ ایسا ہی ہوا۔ یہ تارکین وطن اپنی ذہانت اور محنت کا ثبوت سکولوں کے نتائج میں، تحقیق و تفتیش میں، سائنس اور ریاضیات میں دے رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی دوسرے نتائج ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جیسا کہ میگزین ''ٹائم'' نے لکھا کہ سن 2020ء تک امریکہ میں رہنے والے ان لوگوں کی تعداد جو ہسپانوی یا غیر سفید فام ہیں، دوگنی ہو کر تقریباً ساڑھے گیارہ کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ یورپ سے آ کر آباد ہونے والے اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے۔ مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق اوسط امریکی شہری یہی بتائے گا کہ اس کے آباؤ اجداد کا تعلق افریقہ، ایشیا، ہسپانوی دنیا، جزائر بحرالکاہل یا عرب غرضیکہ سفید فام یورپ کے سوا دنیا کے کسی بھی حصے سے تھا۔

''ان تبدیلیوں کے نتائج کیا ہوں گے؟''

امریکی آبادی میں یہ بنیادی تبدیلی حیرت انگیز رفتار سے وقوع پذیر ہوئی ہے۔ قانونی اور غیر قانونی طور پر بڑے پیمانے پر تارکین وطن یہاں آئے ہیں (غیر قانونی تارکین وطن کی تعداد بیس اور تیس لاکھ سالانہ کے درمیان ہے)۔ مزید برآں تارکین وطن جب آباد ہو جاتے ہیں تو ان کے ہاں بچوں کی پیدائش بڑی تیزی سے ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کے ادیبوں او۔ کے۔ شاٹ اور سانتیانا کا کہنا ہے کہ اس کی آبادی پر آنے والی تباہیوں میں سے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک یہ ہے کہ ان کے مشترکہ کلچر میں بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلی لائی جائے۔

اس غیر معمولی اور بہت بڑے تجربے کا نتیجہ کچھ بھی ہو، اس سماجی عذاب اور عقوبت سے بچنا ناممکن ہوگا۔ شہروں کا عدم استحکام اور چند معاملات میں سماجی ٹوٹ پھوٹ، کثیر النسل اور کئی کثیر اللسانی آبادی کی ایک جگہ سے دوسری جگہ پر تیز رفتار منتقلی نے، جس کے نتیجے میں خاندان بکھر گئے ہیں، وسیع پیمانے پر ہونے والے انتشار میں کردار ادا کیا ہے۔ توقع کے مطابق تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے ان حالات سے مختلف قسم کے ردعمل پیدا ہوئے۔ کچھ نے اپنی بنیادیں افریقہ، آئرلینڈ، اسرائیل، اٹلی، چین یا جہاں کہیں سے وہ آئے تھے تلاش کیں اور یہاں آ کر انہوں نے اپنی الگ الگ بستیاں بسا لیں اور اپنی ہی نسل اور زبان کے لوگوں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ وہ اپنے کلچر، مذہب اور زبان کو تحفظ دینا یا اسے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کا ردعمل اپنی پہچان اور شناخت کے احترام اور تحفظ کے طور پر سامنے آیا۔

دوسرے اس سے قطعی مختلف سمت کی طرف چلے گئے۔ انہوں نے ثقافتی و لسانی رنگا رنگی کو ختم کر دیا اور اپنی ثقافت، نسل یہاں تک کہ جنس کے فرق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور یک رنگ معاشرہ تعمیر کیا۔ اس یک رنگی نے مرد اور عورت کے درمیان فرق کو متنازعہ بنا دیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور یہ کہ ایک کی کمزوریوں کی دوسرے کی طاقت سے تلافی ہو جاتی ہے۔ عورت اور مرد کے اس فرق سے ایک خاندان اتفاق و اتحاد کے ساتھ رہتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان مقابلہ پیدا کرنے سے معاشرے میں تبدیلی آ جائے گی خصوصاً ایسے معاشرے میں جس میں فرد کی اہمیت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جدید انفرادیت تمام سماجی ڈھانچوں اور ذمہ داریوں کو، (وہ بھی جو خاندان نے بنائی ہوئی ہیں) تکمیل ذات کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی ہے اور یوں انہیں استحصال کی شکلیں قرار دے دیا جاتا ہے۔

یہ سماجی عوامل، عورت اور مرد کے فرق کے خاتمہ اور جدید انفرادیت، یہ سب مل کر خاندان کے استحکام کو مزید نقصان پہنچائیں گے۔

''اس سے آپ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟''

بین الاقوامی سیاسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو امریکہ کے لیے اپنی ان پالیسیوں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر اندرونی طور پر تمام لوگوں کا اتفاق رائے حاصل کرنا مشکل ہوگا۔ ایشیائی، ہسپانوی اور سیاہ فام یورپ کے ساتھ اس خصوصی تعلق کو پسند نہیں کریں گے جس کی خواہش یورپی امریکی کریں گے۔ اسی طرح یورپی امریکی بھی دنیا کے باقی علاقوں کے مسائل کے بارے میں مختلف رویہ رکھیں گے۔ چنانچہ امریکی حکومتیں انسانی حقوق کی بنیادوں پر اپنی خارجہ پالیسی کو صحیح ثابت کر کے جتنا چاہے اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کریں، بعض اوقات اس کی خارجہ پالیسی اس کے لیے خطرہ بن جائے گی اور پھر یہ ویسی تیزی کے ساتھ نئی نو آبادیاتی شکل کے طور پر سامنے آئے گی۔

''اب یورپ کی تعمیر کی طرف آتے ہیں۔آپ یورپی کمیونٹی پر یقین رکھتے ہیں لیکن آپ مسٹرک معاہدہ کے نتیجے میں ابھرنے والے یورپ کو مسترد کرتے ہیں۔ کیوں؟''

ماسٹرک معاہدہ بلند تر قومی، مرکز پسند، حاکم بابوؤں کی ریاست، دوسرے معنوں میں یک رنگی یونین، قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے وہ ستون ڈھے جائیں گے جن پر یورپ تعمیر کیا گیا تھا۔ ماسٹرک معاہدہ یورپ کو ایسی جگہ میں تبدیل کر دے گا جہاں ثقافتی یک رنگی ہوگی، جہاں قومی دھندلا جائے گی اور خودمختاری ختم ہو جائے گی۔ یہ معاہدہ پرانی یورپی قوموں کو مصنوعی ریاست میں شامل ہو جانے پر مجبور کرے گا۔ جیسا کہ جارج اورول نے کہا ''دانشوروں کی یہ خاصیت ہے کہ وہ اپنے عصر کے غالب سیاسی جوش و جذبے کو عدم فہم یا عدم ادراک میں تبدیل کر دیتے ہیں۔'' اور یہی لمحہ ہے جب یورپی حکمران طبقے ہر یورپی قوم کی شناخت کو تباہ کر دینے پر تلے بیٹھے ہیں۔

''پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ بارہ یورپی قوموں کے عوام اس پر رضا مند ہو گئے؟''

یورپی یونین خفیہ طور پر بنائی گئی تھی۔ بے احتیاطی یا غیر ارادی طور پر نہیں بلکہ منصوبہ بندی، ہوشیاری اور ہنر مندی کے ساتھ اس کا وجود عمل میں لایا گیا۔ فرانس کے سابق وزیر خارجہ اور 1985ء سے 1989ء تک کے لیے یورپین کمیشن کے رکن کلاڈ چیسوں کا ایک انٹرویو اخبار ''لے فگارے'' کی 7 مئی 1994ء کی اشاعت میں چھپا، جس میں انہوں نے اس کا طریقہ کار بتایا۔ انہوں نے بڑے فخر سے کہا کہ یورپی یونین جمہوریت کی غیر موجودگی ہی میں قائم ہو سکتی تھی اور موجودہ مسائل کی وجہ یہ ہے کہ ماسٹرک معاہدہ پر عوامی بحث و مباحثہ کی خواہ مخواہ اجازت دے دی گئی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

برطانوی اخبار ''دی گارڈین'' نے لکسمبرک میں یورپی عدالت انصاف میں ایک مقدمہ پیش کیا جس میں اس اخفا کی شکایت کی گئی جس میں یورپ سے متعلق فیصلے کیے گئے تھے۔ یورپین کونسل آف منسٹرز کے وکلاء نے ججوں کے سامنے یہ جواب دیا کہ کمیونٹی لاء کا کوئی اصول نہیں ہے جو شہریوں کو یورپی یونین سے متعلق دستاویزات کو دیکھنے اور جانچنے کا حق دیتا ہو۔'' انہوں نے یہ عجیب دعویٰ بھی کیا کہ اگرچہ حکومتی سربراہوں نے یورپی یونین کے معاملات پر زیادہ کشادہ دلی اختیار کرنے پر زور دیا لیکن ان کے اعلانات بے حد اہم سیاسی نوعیت کے تھے اور کیمونٹی کے اداروں کے لیے ان پر عمل کرنا لازمی نہیں۔ چنانچہ انہوں نے ججوں سے کہا کہ گزشتہ دو برسوں کے دوران ہونے والے یورپی یونین کے سربراہی اجلاسوں میں زیادہ کشادگی کے حق میں کیے گئے اعلانات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ بارہ سربراہان مملکت کے بیانات پالیسی اعلانات سے زیادہ حیثیت سے نہیں رکھتے اور ان پر عمل درآمد ضروری نہیں۔

یہ تصور کہ بڑے لوگ ہی سب سے بہتر جانتے ہیں اور عوام تو محض ایک رکاوٹ ہیں، واضح کر دیتا ہے کہ اس وقت یورپی معاشروں اور ان کے حکمرانوں کے درمیان انتہائی گہری اور خطرناک خلیج اور علیحدگی موجود ہے۔

''معاہدہ خفیہ طور پر کیا گیا تھا؟''

خاموشی کے ساتھ بتدریج اقتدار سترہ غیر منتخب ٹیکنوکریٹس کو منتقل کر دیا گیا جو یورپی کمیشن کے ارکان تھے۔ ابتدائی طور پر اختیارات وزراء کی کونسل کو دیئے گئے تھے جو ریاستوں کے منتخب سربراہان پر یا ان کے نمائندوں پر مشتمل تھی۔ وہ یورپ کو تخلیق کرنے کی بجائے قومی پالیسیوں میں چونکہ زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، اس لیے آہستہ آہستہ کمیشن کے ٹیکنوکریٹس کو اختیارات سنبھال لینے کی اجازت دے دی گئی۔ انہیں یورپی یونین کو ترقی دینے کے لیے نئے اقدامات تجویز کرنے کا مکمل اختیار دے دیا گیا۔ ان کی خواہش معمولی نہیں تھی۔ کمیشن کے سبکدوش ہونے والے صدر جیک ڈیکورس نے اعلان کیا کہ مستقبل میں ہر یورپی ملک کے معیشی، سماجی اور مالیاتی امور سے متعلق 80 فیصد قوانین برسلز میں تیار ہوں گے اور ان قوانین کی بنیاد کمیشن کی تجاویز ہوں گی۔

جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، ٹیکنوکریٹ پر انحصار کے رجحان کی شدت نے جو یورپ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیدا کیا ہے وہ بیرونی طور پر بے حد کمزور اور بین الاقوامی معاملات پر اثر انداز ہونے کے قطعی ناقابل ہے۔ اندرونی طور پر ٹیکنوکریسی کی قوت کو خودمختاری، آزادی اور خود کفالت کو تباہ کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

''آپ ٹیکنوکریٹ کی کیا تعریف کریں گے؟''

عام طور پر ٹیکنوکریٹ سابقہ سیاست دان یا سول سرونٹ ہوتا ہے۔ وہ غیر منتخب ہوتا ہے اور دوران ملازمت اسے ہٹانا ممکن نہیں ہوتا اور اسے عوامی مینڈیٹ کے بغیر بے حد وحساب اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ وہ عوام کے سامنے جوابدہ بھی نہیں ہوتا حالانکہ فکری طور پر اسے عوام کے مفادات ہی کی نمائندگی کرنا ہوتی ہے۔

''آپ کس قسم کے یورپ پر یقین رکھتے ہیں؟''

ایسا یورپ جو اس میں شامل ممالک کی قوت، کلچر اور ورثے پر تعمیر کیا گیا ہو۔ اس کے اداروں کی رہنمائی کے لیے بنیادی اصول یہ ہوگا کہ جو کام خاندان کی سطح پر ہوسکتا ہے وہ خاندان ہی کے سپرد ہونا چاہیے اور جو کام مقامی یا علاقائی یا قومی سطح پر ہوسکتا ہے، اسے اسی سطح پر ہونا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جمہوریت اسی صورت میں صحیح طور پر کام کرتی ہے جب اس میں مقامی لوگوں کی شرکت ہو۔ صحت مند جمہوریت میں عوام ہی یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ان کے رہنماؤں کے پاس کون سے اختیارات ہونے چاہئیں۔ جھوٹی جمہوریت میں رہنما فیصلہ کرتے ہیں کہ عوام کو کون سی آزادیاں دی جانی چاہئیں۔

جب حلقہ ہائے نیابت چھوٹے ہوں تو ان کے منتخب نمائندوں کو اپنے حلقوں کے مقامی مفادات کا خیال رکھنا چاہیے۔ جب سیاسی نمائندے دور ہوں گے، بے چہرہ ہوں گے اور انجانے حلقہ ہائے نیابت کے لاتعداد لوگوں کی نمائندگی کرنے والے ہوں گے تو پھر وہ خاص مفاد پرست گروپوں کی نمائندگی کریں گے جن کی لابی کرنے والے بے شمار اور ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔

مزید برآں جمہوریت کو محض نمائندہ نہیں بلکہ شراکتی ہونا چاہیے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ شہریوں کو ایسے معاملات پر فیصلہ دینے کا حق اپنے پاس رکھنا چاہیے جو ان کے معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ بہتر طریقے پر چلنے والی جمہوریتوں میں جیسا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ سوئزرلینڈ میں ایک لاکھ افراد آئین میں تبدیلیاں کرنے کے مسئلہ پر قومی ریفرنڈم کروانے کا اختیار رکھتے ہیں۔ پچاس ہزار افراد کو حق حاصل ہے کہ وہ پٹیشن کے ذریعے دباؤ ڈالیں کہ پارلیمنٹ میں پیش کی جانے والی تجاویز عوامی ریفرنڈم کے لیے پیش کی جائیں لیکن برطانیہ میں حکومت نے بڑے طریقے سے معاہدہ ماسٹرک پر ریفرنڈم کرانے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ ایسا معاہدہ ہے جو برطانیہ کی قومی خودمختاری کو تیزی کے ساتھ ختم کر دے گا۔ اس سلسلے میں حکومت کا کہنا یہ ہے کہ ریفرنڈم برطانوی سیاسی نظام کا حصہ نہیں ہے۔ حالانکہ جب برطانیہ یورپی کمیونٹی میں شامل ہوا تھا تو اس وقت برطانوی عوام کو قومی ریفرنڈم کے ذریعے اپنے موقف کے اظہار کا موقع دیا گیا تھا۔ اصل وجہ یہ ہے کہ حکومت جانتی ہے کہ برطانوی عوام ماسٹرک معاہدے کو شدت کے ساتھ مسترد کر دیں گے۔ ایسے اہم مسئلہ پر ووٹ کا حق دینے سے انکار کے موجودہ حکومت ان عوام کے لیے اپنی تحقیر کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

شراکتی جمہوریت وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے سیاستدانوں کے منتخب ہونے کے بعد ان کے اختیار پر کنٹرول کیا جاتا ہے۔ شراکتی جمہوریت اس بات کی ضمانت بھی مہیا کرتی ہے کہ ذمہ داری بالآخر ووٹروں ہی کی ہوتی ہے۔ ریفرنڈم کرانے کا حق مقامی اور قومی سطح پر حاصل ہونا چاہیے۔

"لیکن یورپی رہنماؤں نے ہمیشہ معاونت کا اصول تسلیم کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ عدم مرکزیت حاصل کریں گے۔"

معاونت کا لفظ یورپ کے ٹیکنوکریٹس نے مرکزیت کے لیے اپنی ہوس کو نقاب اوڑھانے کی خاطر استعمال کیا ہے۔ حقیقت میں اس کا مطلب تو اختیارات کی زیادہ سے زیادہ عدم مرکزیت ہے لیکن یہ لفظ اپنی حرمت کھو بیٹھا ہے۔ یہ کیسا دھوکا ہے کہ کمیشن اعلان تو کرتا ہے کہ وہ معاونت کی روح کے مطابق کام کر رہا ہے لیکن ساتھ میں یہ اعلان بھی کرتا ہے کہ 80 فیصد قومی قوانین برسلز میں تیار ہوں گے۔

"برسلز کو کن شعبوں کی ذمہ داریاں سنبھالنی چاہئیں؟"

بنیادی طور پر دفاع، ڈپلومیسی، ماحولیات کا تحفظ اور یورپ کے اندر آزاد داخلی منڈی کو جاری رکھنا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''اس مقصد کے لیے کن اداروں کی ضرورت ہو گی؟''

اعلیٰ ترین ادارہ وزراء کی یورپی کونسل کو ہونا چاہیے اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ یہ کونسل منتخب سربراہان مملکت اور ان کے نمائندوں پر مشتمل ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ موجودہ نظام میں ہر یورپی ملک کا نمائندہ اپنی باری پر چند ماہ کے لیے کونسل کا صدر بن جاتا ہے۔ کونسل کا نائب صدر مقرر ہونا چاہیے جو ارکان کے سامنے جوابدہ ہو گا۔ اس طریقہ کار سے اختیارات کے تسلسل کی ضمانت ملے گی۔ وگرنہ جیسا کہ ہم تجربہ کر رہے ہیں۔ کمیشن کے ٹیکنو کریٹس خلا کو پر کر دیں گے۔

''یورپی کمیشن کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

اسے کونسل کے انتظامی سیکرٹریٹ کے طور پر کام کرنا چاہیے۔ اس سے ایگزیکٹو اور قانون سازی کا اختیار واپس لے لینا چاہیے۔ اس طرح یہ بہتر اور منظم طریقے سے وہی کام کرے گا جس کی توقع جمہوریت اپنے اداروں سے کرتی ہے۔

''دفاع اور ڈپلومیسی کے کس قسم کے ڈھانچے کی ضرورت ہو گی؟''

یہ امور ایسی یورپین سکیورٹی کونسل کے سپرد کر دینے چاہئیں جو اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل سے زیادہ مختلف نہ ہو۔ یورپ کے ممالک جو فوجی استعداد کا زیادہ حصہ مہیا کریں گے، یورپین سکیورٹی کونسل کے بنیادی ارکان ہوں گے۔ تمام یورپی ممالک کو حق حاصل ہو گا کہ اگر چاہیں تو وہ فوجی کارروائیوں سے متعلق یورپین سکیورٹی کونسل کے فیصلوں سے خود کو الگ رکھیں۔ کونسل کو یہ اختیار ہو گا کہ ضرورت کے وقت ایسے ملکوں کو مسلح افواج کی خدمات مہیا کریں جو کسی کارروائی میں شریک ہونے پر رضا مند ہوں۔ اس طرح یورپ کی مشترکہ فوج قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔

یورپ کے دفاع کا اصل مقصد یورپ کے اہم ترین مفادات کو تحفظ مہیا کرنا اور خصوصاً کسی فوجی یا بے قابو مداخلت بے جا کے خلاف اس کی سرحدوں کو تحفظ دینا چاہیے۔ اسے انسانی بنیادوں پر مدد دینے کے پردے میں نو آبادیاتی معرکہ آرائیوں سے الگ تھلگ رہنا چاہیے۔ جن کا مقصد کسی ملک میں وہاں کے سیاستدانوں کی مدد کرنا رہ جاتا ہے۔

''بے قابو مداخلت بے جا سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

اس سے میری مراد آبادی کی ایسی منتقلی ہے جو غیر منظم اور بے قابو ہو۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''یورپین سکیورٹی کونسل، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور نیٹو کے درمیان کس قسم کا تعلق ہونا چاہیے؟''

اب جبکہ سرد جنگ ختم ہو چکی ہے، یورپ میں شعور کی پختگی آ جانی چاہیے۔ یہ واہیات سوچ ہے کہ 25 کروڑ امریکیوں سے کہا جائے کہ وہ کسی انجانے دشمن کے خلاف 35 کروڑ یورپی باشندوں کو تحفظ مہیا کریں۔ یورپ اور امریکہ کو خودمختار حلیفوں کے طور پر کام کرنا چاہیے اور رہا نیٹو، تو وہ ایڈہاک تعاون کے لیے ڈھانچے کا کام کر سکتا ہے۔

''اور ماحولیات کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

ماحولیاتی مسائل کے لیے سرحدیں بے معنی ہوتی ہیں۔ اس لیے یورپ کی سطح پر مسلمہ اصول مقرر ہونے چاہئیں اور پورے یورپ میں ان پر عمل درآمد کیا جانا چاہیے۔ یورپی ڈپلومیسی کو چاہیے کہ ان اصولوں کی بین الاقوامی سطح پر منظوری حاصل کرے۔ ماحولیاتی تباہی کو جہاں تک ممکن ہو سکے روکنا چاہیے یا فوری اور موثر بین الاقوامی اقدام کر کے اس کا سدباب کرنا چاہیے۔

''آپ کے خیال میں یورپی پارلیمنٹ کا کیا کردار ہونا چاہیے؟''

پارلیمنٹ کے بارے میں بات کرنے سے پہلے میں ایک آخری یورپی ادارے کا ذکر کرنا چاہوں گا جو میرے خیال میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ تمام ادارے، جب تنزل کا شکار ہوتے ہیں تو سینٹرلائز ہو جاتے ہیں اور ان پر بیوروکریسی کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ فلاڈلفیا میں امریکہ کے آباؤ اجداد نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کا جو خاکہ تیار کیا تھا وہ آزاد لوگوں کی صحیح معنوں میں فیڈریشن کا تصور تھا۔ امریکہ کے نوبل انعام یافتہ ماہر اقتصادیات جیمز بکان نے حال ہی میں کہا تھا کہ امریکہ ایک ایسی ریاست میں تبدیل ہو چکا ہے جو مرکزیت پسند ریاستوں سے زیادہ مختلف نہیں اور جیمز میڈیسن یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اس کا فیڈرلزم کا تصور تنزل کا شکار ہو کر مرکزیت پسند دریائی جانور کی شکل اختیار کر لے گا۔

نئے ادارے کا اہم ترین فرض یہ ہو گا کہ وہ مرکز میں اختیارات جمع نہ ہونے دے۔ Decentralization کو بنیادی اصول ہونا چاہیے، اس لیے کہ یورپ کی تعمیر اسی اصول پر کی گئی ہے۔

جہاں تک یورپی پارلیمنٹ کا تعلق ہے یہ مصنوعی جمہوری ادارہ ہے۔ اس پر دو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑی جماعتوں کا غلبہ ہے یعنی سوشلسٹ پارٹی اور کرسچین ڈیموکریٹک پارٹی کا اور دونوں ہی اعلیٰ ترین قومی، مرکزیت پسند یورپی ریاست کے اس تصور کو مانتی ہیں جو یورپی کمشن نے پیش کیا ہے۔ اس کا اصل مقصد تو کمیشن کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔

جب وزراء کی یورپی کونسل اور کمیشن کے درمیان عدم اتفاق ہوتا ہے تو اس تصادم کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ تصادم برسلز کے ٹیکنوکریٹس اور یورپی قوموں کے منتخب نمائندوں کے درمیان ہے۔ ایسے مقابلے میں یورپی پارلیمنٹ فطری طور پر ٹیکنوکریٹس کی حلیف ہو گی جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ ان کے مفادات ایک ہیں۔ مزید برآں وہ یہ مفادات قومی پارلیمنٹوں کو غلام بنا کر حاصل کر سکتے ہیں۔ یورپی پارلیمنٹ اور کمیشن کی قوت قومی جمہوری اداروں کے مقابلے میں معکوس تناسب میں پوشیدہ ہے۔ قومی ادارے جس قدر کمزور ہوں گے برسلز کے ٹیکنوکریٹس اتنے ہی مضبوط ہوں گے۔ چنانچہ یورپی کمیشن اور یورپی پارلیمنٹ کے مقاصد ایک ہیں اور ان کے دشمن بھی مشترکہ ہیں۔

''آپ کے منصوبے کے تحت یورپی پارلیمنٹ کو کس قسم کے اختیارات تفویض کیئے جانے چاہئیں؟''

اس کا اختیار ان چند امور کی نگہداشت تک محدود ہونا چاہئے جنہیں یکجا کرنے کی ضرورت ہے۔

یورپی پارلیمنٹ کے پاس یورپی یونین اور تیسرے فریقوں کے درمیان معاہدوں کی توثیق کے علاوہ یونین میں نئے ملکوں کو شریک کرنے کے فیصلہ کا حق پہلے سے ہے۔ یہ اختیارات قابل قبول ہیں۔ ان کے علاوہ اسے یورپی اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر تعیناتی کی منظوری دینے کا حق بھی ہونا چاہیے۔ اسے کمیشن کی رکنیت کی منظوری کا اختیار دیا گیا ہے لیکن فی الحال وہ یہ اختیار غیر ذمہ دارانہ طور پر ادا کر رہی ہے۔ وہ صحیح معلومات کے بغیر ہی ووٹ دے دیتی ہے۔ اس کی عام تصدیق نہیں کرائی جاتی، جس کے نتیجے میں نہ تو پارلیمنٹ کے ارکان اور ان ہی لوگوں کو امیدواروں کے بارے میں جاننے کا موقع دیا جاتا ہے۔

''یورپی بجٹ کے کنٹرول کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

پارلیمنٹ کو یہ فرض پہلے ہی سے تفویض کیا گیا ہے کہ مرکزی یورپی بجٹ کی منظوری دے اور ساتھ ہی ختم ہونے والے سال کے حسابات پیش کرے۔ یہ بالکل ایسے ہی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے جیسے کسی کارپوریشن کے سالانہ حسابات کو اس کے حصہ داران کے سالانہ اجلاس میں منظور کیا جائے۔ لیکن پارلیمنٹ کی نااہلی کی ایک اور مثال بھی ہے۔ سال 1982ء اور سال 1992ء کے حسابات شدید بے ضابطگیوں کی وجہ سے مسترد کر دیئے گئے۔ آپ کو خیال ہو گا کہ اس قسم کا اقدام ایک بڑا واقعہ ہو گا جس کے نتائج بھی اسی اہمیت کے حامل ہوں گے۔ لیکن جناب نہیں۔ حسابات بغیر منظوری ہی کے پڑے رہے اور کمیشن بڑی مستعدی کے ساتھ فنڈز تقسیم کرنے میں مصروف رہا۔

''یورپی پارلیمنٹ کو اور کون سے اختیارات دیئے جانے چاہئیں؟''

میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے یہ صراحت فہرست پیش کرنے کی بجائے مثالیں مہیا کی ہیں لیکن اس وقت تو یورپی پارلیمنٹ کا کام وقت کا ضیاع یا تباہی کے راستے پر لے جانے والا ہے۔ موخذ الذکر قسم میں، میں ہر قسم کی قانون سازی اور یورپی پارلیمنٹ سے غیر متعلقہ امور کے بارے میں دستاویزات کو شامل کرتا ہوں اس لئے کہ یہ ذمہ داری قومی پارلیمنٹوں کی ہونی چاہیے۔ اس پارلیمنٹ کو اختیارات تفویض کرتے وقت ہمیں بہت زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ جب آپ چھ سو افراد کو قوانین منظور کرنے کے لیے تنخواہ دیتے ہیں تو وہ قوانین منظور کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر بے فائدہ اور بے مقصد ہوتے ہیں۔

''آپ واحد کرنسی کے خلاف ہیں۔ کیوں؟''

واحد کرنسی کے اثرات بندوبست اور انتظام و انصرام کی حد سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ یہ اثرات یورپ کے سیاسی ڈھانچہ کے ساتھ ساتھ ان کے معاشروں کے استحکام بھی تبدیل کر کے رکھ دیں گے۔

کرنسی، انتظامی آلہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک معاشرے کی اقتصادی اور سماجی حالت کا مظہر بھی ہوتی رہے۔ دستیاب دولت کی تعداد کا تعین اس طریقے سے کیا جانا چاہیے کو جو افراط زر کے ناقابل قبول سطحوں، کرنسی کی قیمت میں کمی یا دوسری رکاوٹوں کی طرف نہ لے جائے۔ ظاہر ہے کہ واحد کرنسی مرکز کے قابو میں ہو گی اور اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہر یورپی ملک کی بنیادی اقتصادی حکمت عملی کا تعین بھی مرکزی سطح پر ہی کیا جائے گا۔

واحد کرنسی کی تجویز کا اصل مقصد دباؤ کے ذریعے واحد یورپی ریاست کی تخلیق

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ جبکہ بہانہ معیشی تصور کے فروغ کا ہے یورپی ٹیکنو کریٹس کی خفیہ کارروائی کی یہ ایک اور مثال ہے جس کے ذریعے یک رنگی یورپی یونین کے مقصد کو حاصل کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ واحد کرنسی یورپی معاشروں کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دے گی۔ واحد کرنسی کو یکساں طور پر مسلط کرنے کے اثرات کو جاننے کے لیے اٹلی کو دیکھئے۔ شمالی اٹلی کی معیشت باقی یورپ کی نسبت کہیں زیادہ مستحکم ہے جبکہ جنوبی اٹلی کی کرنسی کی صورت ایسی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جنوب میں جو کرنسی استعمال کی جاتی ہے اسے شمالی، جنوبی اٹلی کی معیشتوں میں موجود فرق کو ظاہر کرنے کے لیے شمال کی کرنسی کے مطابق صرف اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ جنوبی اور شمالی اٹلی میں ایک ہی کرنسی ہے۔ جنوب میں معیشت ایک جگہ رکی ہوئی ہے اور بیروزگاری بڑھ گئی ہے۔ جنوبی اٹلی کے بیروزگار روزگار کی تلاش میں شمالی اٹلی کو چلے گئے اور اس نقل مکانی کو روکنے کی خاطر اٹلی نے جنوب میں سرمایہ کاری میں حکومتی شرکت کو لازمی بنایا تاکہ روزگار کے مواقع میسر آ سکیں۔ اس مقصد کے لیے سیسا ڈیل میزوگی اور نو جیسے خصوصی ادارے قائم کیے جن کے ذریعے فنڈز کی بھاری تعداد جنوب کی طرف منتقل کی گئی لیکن یہ پالیسی ناکام ہو گئی۔ سرمایہ کاری کا زیادہ تر حصہ، بیوروکریسی کے تیار کئے ہوئے بے مقصد بڑے منصوبوں پر خرچ کیا گیا۔ اس فنڈز کا ایک اور بڑا حصہ تقسیم کر لیا گیا یا سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا۔ اس طرح روزگار کی سہولتیں پیدا کرنے کی بجائے حکومتی مدد نے بدعنوانیوں کو جنم دیا۔ اس کے علاوہ آبادی کی منتقلی بھی نہ رک سکی اور جنوب کے لوگ بھاری تعداد میں شمال کی طرف جاتے رہے اور وہاں عدم استحکام پیدا ہو گیا۔ اسے آپ مشترکہ زہر خورانی کی واردات کہہ سکتے ہیں۔ جنوب کے خاندان اور برادریاں تباہ ہو چکی ہیں اور شمال میں شہروں کے اندر کچی اور گندی بستیوں کی بہتات ہو گئی ہے جس سے وہاں سماجی بحران پیدا ہو گیا۔

اس غلطی کی وجہ سے شمالی اٹلی میں بہت زیادہ غصہ اور ناراضگی پیدا ہوئی ہے اور ''لومبارڈی لیگ'' کا قیام اسی غم وغصہ کا نتیجہ ہے۔ لومبارڈی لیگ کے پلیٹ فارم سے شمال کی خودمختاری بحال کرنے کا نعرہ لگنے لگتا ہے۔ اس وقت لیگ ایک اہم سیاسی تحریک بن چکی ہے اور موجودہ مخلوط حکومت کا حصہ ہے۔

یہ امدادی رقوم ایک ہی قوم کو دی گئیں اور ایک ہی قوم کے اندر آبادی کی منتقلی بھی ہوئی، اسکے باوجود ان سے علیحدگی پسندی کے شدید جذبات پیدا ہوئے۔ ذرا تصور کریں کہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اگر یہ سب کچھ دو ملکوں کے درمیان ہوا ہوتا، یونان اور نیدر لینڈ یا سپین اور جرمنی کے درمیان ناراضگی کس قدر شدید ہوتی۔ بلاشبہ اگر مستقبل میں کبھی یونان اور سپین یا کوئی اور ملک اپنے ہاں کے معاشی استحکام کی موجودہ سطحوں کو برقرار نہ رکھ سکے تو کس قدر کشیدگی پیدا ہوگی۔ واحد کرنسی کے ساتھ کوئی بھی ملک اپنے اقتصادی حقائق کے انعکاس کے لیے اپنی کرنسی کی قیمت کو کم یا زیادہ کرنے کے قابل نہیں ہوگا۔ نتیجہ وہی ہوگا جو اٹلی میں سامنے آیا بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ تباہ کن نتیجہ سامنے آئے گا۔ ناکام ملکوں کے لوگ دوسرے ملکوں کی طرف رخ کریں گے، بڑے پیمانے پر نقل وطن ہوگی، کامیاب ملکوں کے شہروں میں عدم استحکام پیدا ہوگا۔ مرکز گریز قوتیں پیدا ہوں گی جو علیحدگی کی پر تشدد تحریکوں کو جنم دیں گی اور یوں پورا یورپ تتر بتر ہو جائے گا۔

یورپی کمیشن کے ٹیکنوکریٹس اس بات کو سمجھتے ہیں اور ماسٹرک معاہدے میں دو شقیں آرٹیکل 123 اور آرٹیکل 130 سی کے علاوہ ''اقتصادی اور سماجی اتصال'' کے بارے میں ایک خصوصی معاہدہ شامل ہے۔ ان اقدامات کا مقصد پورے یورپ کی سطح پر کاسا ڈیل میزو جیورنو جیسے پیچیدہ اداروں کا قیام ہے۔ اس سے یہ تصور کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ نتائج وہی نہیں ہوں گے۔ اس سب کچھ اور دنیا میں عدم استحکام کے باوجود یورپی کمیشن کے ٹیکنوکریٹس یہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو روزگار کی طرف جانا چاہئے روزگار کو لوگوں کی طرف نہیں آنا چاہیے۔ یہ بات ان کی جہالت کی تصدیق کرتی ہے وہ نہیں جانتے کہ معاشرے کیسے چلتے ہیں۔ ایک مستحکم معاشرے میں ایک خاندان کے تمام ارکان اپنے دوستوں اور ہمسائیوں کے ساتھ مل کر رائے عامہ تیار کرتے ہیں جن سے جوان ہوتے ہوئے بچوں کے رویے بنانے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن روزگار تلاش کرنے کے لیے اگر ماں، باپ اور بچوں کو کہیں اور جانے پر مجبور ہونا پڑے تو اس صورت میں وہ اثرات جو بچوں کی تعلیم و تربیت میں مدد دیتے ہیں، تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پیچھے رہ جانے والے بزرگ ریٹائرڈ لوگوں کے خصوصی گروپوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ عام طور پر بچے کی اخلاقی اقدار کو شکل دینے کی ذمہ داری سکولوں کو منتقل ہو جاتی ہے جو خود انتہائی گہرے اخلاقی بحران کا شکار ہیں۔ بچے خیراتی معاشرے کے گمنام ارکان بن جاتے ہیں جن کے رشتہ دار نہیں ہوتے، جو روزگار کی تلاش میں باہر جانے والے والدین کی جگہ لے سکیں۔ خاص طور پر جب خاندان بکھرتے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں تو پھر بچے شہر کے بدقماش لوگوں کے گروپوں کے گماشتے بن جاتے ہیں۔

اچھے شہر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے والے مہمانوں کی چھاؤنیاں نہیں ہوتے، نہ ہی یہ سڑکوں کے جال کا نام ہے اور نہ ہی کواٹروں میں رہنے والی بھیڑ کو شہر کہا جا سکتا ہے۔ یہ طویل عرصے سے قائم انسانی آبادی کا نام ہے۔ ایسے معاشرے کا نام ہے جو نسلوں پر محیط ہوتے ہیں، ایک ایسی پیچیدہ سماجی تنظیم کا نام ہے جو احساس فخر پیدا کرتی ہے۔ بستیاں گندی ہوں، سماجی ڈھانچہ تتر بتر ہو رہا ہو تو ایسے حالات شہر کے لوگوں کے دلوں کو زخمی کر دیتے ہیں اور ردعمل کے طور پر لوگ اپنے خول میں بند ہو جاتے ہیں۔ اٹلی کا شہر سینا ایک صحت مند شہر کی بہترین مثال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس شہر کا سماجی استحکام برقرار رہے اور وہاں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔

''یورپی کرنسی کے لیے آپ کی کیا تجویز ہیں؟''

میں سمجھتا ہوں کہ ہر ملک کو اپنی کرنسی رکھنی چاہیے جو ایک معینہ شرح پر یورو کرنسی (یورپ کی ایک کرنسی) میں تبدیل ہو جائے۔ یورو کرنسی کو یورپین سنٹرل بینک چلائے گا جس کا کام اس کی قدر کو برقرار رکھنا اور یہ ضمانت مہیا کرنا ہو کہ قومی کرنسیوں کی قیمت میں کمی یا اضافہ برباد کر دینے والا نہیں ہوگا بلکہ اقتصادی حقیقت کا مظہر ہوگا۔ یورپی کرنسی مقامی کرنسی کی بجائے خالصتاً ریزرو کرنسی ہوگی جو مقامی معیشت اور سیاسی ضرورت کو پورا کرے گی۔

واحد اور مشترکہ کرنسی میں فرق یہ ہے کہ واحد کرنسی متعین ہوتی ہے، اس میں لچک نہیں ہوتی اور یہ ہر ملک کی معاشی حقیقتوں کے ساتھ لگاؤ کھانے کی اہل نہیں ہوتی۔ مشترکہ کرنسی لچک دار ہوتی ہے اور ان تبدیلیوں کے مطابق خود کو ڈھال لیتی ہیں جو قومی معیشتوں پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔

''آپ کا تصور برطانیہ کے ٹھوس یورپی کرنسی کی تجویز کے بہت مشابہ ہے۔''

ہاں! بہت سے معاملات میں۔ درحقیقت میں نے سب سے پہلے 12 جون 1990ء کو لندن میں انسٹی ٹیوٹ آف ڈائریکٹرز کے سالانہ لیکچر کے موقع پر مشترکہ کرنسی کی تجویز دی تھی۔ برطانوی حکومت کا منصوبہ اکتوبر 1990ء میں شائع ہوا۔ بہرحال میں پہل کا دعویٰ نہیں کر رہا۔ اکثر اوقات ہوتا یوں ہے کہ ایک خیال یا تصور فضا میں ہوتا ہے اور بہت سے لوگ اس سے زیادہ یا کم متاثر ہوتے ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''جرمنی کس قسم کا یورپ چاہتا ہے؟''

جرمنی کی حکمران جماعت کرسچین ڈیموکریٹس نے ستمبر 1994ء میں ''یورپی پالیسی کے بارے میں خیالات'' کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا۔ اس کا مقصد غیر مبہم ہے اور وہ یہ کہ ایک مکمل ریاست کی تخلیق کی جائے، یورپی پارلیمنٹ کو واحد ریاست کے لئے مناسب قانون تیار کرنے والے قومی ادارے میں تبدیل کرنا وزارتی کونسل کو دوسرے پارلیمنٹری چیمبر میں تبدیل کرنا اور کمیشن کو بااختیار یورپی حکومت بنانے کی اجازت دینا ہے۔ نئی یورپی عظیم ریاست کو آزاد عالمی تجارت کے نظریے پر تعمیر کیا جائے گا۔ اسے توسیع دے کر مشرقی یورپ اور وسطی یورپ کے ممالک شامل کئے جائیں اور روس کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر پارٹنر شپ کو فروغ دیا جائے گا۔ یقیناً یورپ کے مرکز میں جرمنی ہے اور اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے۔

''کیا یورپی یونین کے قیام کے عمل میں تبدیلی اب بھی ممکن ہے یا ہم ایک عظیم تر قومی یونین کے قیام کو حاصل کرنے پر ضد ہیں؟''

1996ء میں یورپ کے ڈھانچے پر دوبارہ غور کرنے کے لیے بین الحکومتی کانفرنس منعقد ہوگی۔ اس عمل کو تبدیل کرنے کے لیے تمام تر کوششیں بروئے کار لانے کا وہی وقت ہوگا۔ یہ جنگ قومی سطح پر ہوگی۔ ہر یورپی ملک میں ''ملکوں کے یورپ'' کی بنیاد پر نئے معاہدے کے لیے سیاسی اتحاد قائم ہوں گے۔ اور وہ ایسا اقدام کریں گے جس سے اس بات کی ضمانت ملے کہ آخری فیصلہ جمہوری طریقے سے کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یورپی ملک میں قومی ریفرنڈم ہو۔

''کیا چھوٹے ملکوں کے لیے اب بھی زندہ رہنا ممکن ہے؟''

بالکل ہے اور وہ زندہ ہیں۔ مقامی جمہوریت جو ہر چھوٹی ریاست کا جزو لاینفک ہوتا ہے، بڑی ریاستوں کی مبہم جمہوریت سے کہیں زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ چھوٹے جمہوری ملکوں کے معاشرے کو زیادہ مستحکم رہنے کا موقع ملتا ہے جبکہ بڑی ریاستوں میں ایسا ممکن نہیں اس لئے کہ وہاں آبادی کی جڑیں نہیں ہوتیں اور وہ گمنام ہوتی ہیں۔ دفاع اور ڈپلومیسی کے حوالے سے چھوٹے ملکوں کے لیے دقتیں ہوتی ہیں۔ انہیں ایک بڑی موافق آزاد منڈی تک رسائی کی ضرورت بھی ہوگی جہاں انہیں جدید معیشتوں کی ضرورت کے مطابق مسابقتی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حالات مہیا ہوسکیں۔ لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ قوموں کے ایک خاندان پر مشتمل ڈی سنٹر پلائزڈ یورپی کمیونٹی، چھوٹی قوموں کی خودمختاری اور ان کے تشخص کو تباہ کئے بغیر مطلوبہ دفاعی اور سفارتی قوت کے ساتھ ساتھ ایک بڑی آزاد منڈی مہیا کرسکتی ہے۔

بہرحال بڑی، سنٹرپلائزڈ اور رنگا رنگ ثقافت رکھنے والے ممالک یہ ثابت نہیں کر سکے کہ وہ قائم و برقرار رہ سکتے ہیں۔ سوویت یونین ختم ہو چکا ہے۔ امریکہ عجیب دریائی جانور بن چکا ہے جو اپنی مرکزیت کے باعث کافی مفلوج ہو چکا ہے۔

''نئے عالمی نظام کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

ہم نے یقیناً اس کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ میرے خیال میں اس کو یہ ضمانت دینی چاہیے کہ ہر قوم کا یہ حق ہے کہ وہ پرامن طور پر اپنے طریقے سے اپنی ثقافت اور روایات کے مطابق زندگی گزارے چاہے وہ ہمارے لیے اجنبی یا ہمارے فہم و ادراک کے بغیر کیوں نہ ہو۔ سماجی رنگا رنگی کے تصور کا احترام ہونا چاہیے۔ جب ہم اپنے مغربی معاشروں پر نظر ڈالتے ہیں اور اپنا ننگا پن دیکھتے ہیں تو ہمیں دوسروں کے لیے عاجزی اور انکساری کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب4

فلاحی ریاست کے تصور پر نظر ثانی

''بہت سے ترقی یافتہ ممالک اپنے ہاں عوامی بہبود کے نظاموں کے ڈھانچوں پر دوبارہ غور کر رہے ہیں۔آپ کا کیا نقطہ نظر ہے؟''

عالمی سطح پر فلاحی ریاست کو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ اس پر اٹھنے والے اخراجات اور اس کے سماجی نتائج قابل برداشت ہیں۔ باضابطہ ریاستی بہبود کا اصل مقصد ضرورت مندوں کو تحفظ فراہم ہونا چاہئے۔ اس کا مقصد شہریوں، خاندان، مقامی آبادیوں، مذہبی گروہوں اور دوسرے ڈھانچوں کی فطری ذمہ داریوں کو ختم کرنا نہیں ہونا چاہیے۔ اس لئے یہ ڈھانچے یا ادارے کسی ایک صحت مند معاشرے میں فرد اور ریاست کے درمیان مختلف سطحوں پر مداخلت کرتے ہیں۔

وہ لوگ یا ادارے جو ان حالات کو تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں جن کی وجہ سے مضبوط جمہوری ملک قائم و دائم رہتا ہے۔ درحقیقت شہریوں اور ان کے خاندانوں کو ریاست کا محتاج بنا کر ان کا اپنے آپ پر انحصار کم کر دیتے ہیں۔ اس کا یقینی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ریاستی نوکر شاہی مضبوط اور شہری معاشرہ کمزور ہو جاتا ہے۔

یورپ کی تعمیر سے متعلق بحث کرتے وقت ہم نے لفظ معاونت(Subsidiarity) پر بات کی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ یہ لفظ کس کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہونا چاہئے کہ ہر وہ کام خاندان کے سپرد کر دینا چاہئے جو خاندان کی سطح پر ہوسکتا ہے۔ ہر وہ کام جو مقامی، سماجی یا مذہبی گروہوں کے ذریعے ہوسکتا ہے اسے انہی کے سپرد کر دینا چاہئے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

علاقے کا کام جو وہ کر سکتا ہے اس کے حوالے کر دینا چاہیے اور ریاستی نوکر شاہی کے پاس صرف وہ ذمہ داریاں ہونی چاہئیں جنہیں مرکز سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ تصور کہ معاشرہ افراد کی اکثریت پر مشتمل ہی ہوتا ہے، غلط ہے۔ حقیقت میں مضبوطی معاشرہ خاندانوں اور مقامی آبادیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہی وہ اینٹیں ہیں جن سے عمارت تعمیر ہوتی ہے اور معاشرے کے یہی لازمی عناصر ہیں جن کی ذمہ داریاں اور اختیارات کم کر کے عالمی فلاحی ریاست کو کمزور کیا جاتا ہے۔ اگر آپ ایک خاندان کی یہ ذمہ داری ختم کر دیں کہ وہ بچوں کو صحت، تعلیم اور ان کی بہبود کے لیے سہولتیں فراہم کرے تو آپ اس خاندان میں موجود توازن اور ہم آہنگی کو تباہ کر دیتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ گروہ یا کمیونٹی تباہ ہو جاتی ہے جس کا وہ خاندان حصہ ہے۔ بچے ریاست کے قیدی بن کر رہ جاتے ہیں۔

ریاستی مداخلت کے بنیادی تصور کو تبدیل کرنے کے لیے دور رس اصلاحات تجویز کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ کام قومی سطح پر بحث و مباحثہ اور ریفرنڈم کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ آزاد معاشرے میں اس قسم کی بنیادی تبدیلیوں کو جائز قرار دلوانے کے لیے عوام کی تائید و حمایت حاصل کرنا بے حد ضروری ہے۔

''ہیلتھ سروس کے لیے آپ کن تجاویز سے ابتدا کرتے ہیں۔''

ایک خوشحال اور مہذب معاشرے کو اپنے تمام شہریوں کو یہ ضمانت مہیا کرنی چاہئے کہ انہیں بہتر طبی سہولتیں میسر ہوں گی۔ تو اب سوال مقصد کی بجائے ذرائع کا ہے۔

طبی سہولتیں فراہم کرنے کے طریقہ کی بنیاد معاونت اور تفاوت کے جڑواں اصولوں پر ہونی چاہئے۔ مقامی آبادیاں (Communities) اسی وقت برقرار رہتی ہیں، مستحکم اور خوشحال ہوتی ہیں جب ان کے لوگوں کو بڑے شہروں میں نہ دھکیلا جائے اور مقامی ہسپتالوں تک ان کی رسائی ہو اور ان ہسپتالوں میں ان کے افراد کا بہتر علاج ہو سکے۔ بہتر خدمات کے لیے سنٹرلائزیشن ضروری ہے تاکہ علاج مہنگا نہ ہو اور ہسپتال زیادہ وسیع علاقے کو طبی سہولتیں فراہم کر سکے۔ جن لوگوں کو خصوصی علاج کی ضرورت ہو تو مقامی ہسپتال ان مریضوں کو خصوصی ہسپتالوں میں بھیجیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عام ہسپتال ڈی سنٹرلائزڈ ہوں جبکہ خصوصی ہسپتال سنٹرلائزڈ ہونے چاہئیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طبی سہولتوں میں تفاوت یا رنگا رنگی کا مقصد انتخاب مہیا کرنا اور معیار کو بہتر بنانا ہے۔ یہ کام مقابلے کی فضا پیدا کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان ملکوں میں جہاں ایسا نظام پہلے سے موجود ہے، وہاں اس قومی نظام کو برقرار رکھنا۔ اسے مزید بہتر بنانے سے ممکن ہو سکتا ہے۔ ایسے ہسپتالوں کی کثرت ہونی چاہئے جو ڈاکٹروں کی امداد باہمی، مذہبی گروہوں، مقامی آبادیوں، خیراتی اداروں اور نجی اداروں کے ذریعہ چلیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ سرکاری ہسپتال میں قائم رہنے چاہئیں جو پہلے ہی سے طبی سہولتیں فراہم کرنے کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ریاست کا کردار بڑا ہی رہے گا۔ ایسا قانون ہونا چاہئے جس کے تحت ہر شخص اپنی پیدائش کے وقت سے صحت کے بیمہ کا حق دار ہو۔ یہ بیمہ زندگی بھر کے لیے ہو اس لیے بیمہ کرنے والوں کے لیے کسی مرد یا عورت کی صحت خراب ہونے کی صورت میں اسے بیمہ کی سہولتیں فراہم کرنا غیر قانونی اقدام ہو۔ چونکہ ہر شخص زندگی بھر کے لیے بیمہ شدہ ہو گا، اس لیے پیدائش کے وقت طبی سہولتوں کا فرق بیمہ کی شرح ادائیگی سے متعین ہو گا۔ بیمہ کے پریمیم کی ادائیگی اتنی ہو گی کہ پیدائش کے وقت انسانی زندگی کو عمومی طبی سہولتیں فراہم ہوں۔ اس طرح زندگی بھر کے لیے ہر شخص کے لیے ہی قسط ہو گی۔

بیمہ کرنے والے سرکاری اور نجی دونوں ہی ادارے ہو سکتے ہیں۔ سرکاری بیمہ ان ملکوں میں ہو گا جہاں پہلے ہی سے بیمہ کی سہولتیں قومی سطح پر مہیا ہیں۔ ریاستی سطح پر یہ سہولت مہیا ہونے سے لوگوں کو انتخاب کرنے کا حق حاصل ہو گا اور اس سے مقابلہ کی فضا بھی پیدا ہو گی۔

لازمی بیمہ کے نام پر دھچکا نہیں لگنا چاہئے۔ یہ پہلے ہی رائج ہے۔ اگر آپ کار چلاتے ہیں تو قانون کے تحت آپ کو تھرڈ پارٹی رسک کے خلاف بیمہ کرانا ہو گا اور بہت سے ملکوں میں جہاں قومی صحت سروس مہیا کی جاتی ہے، صحت کا لازمی بیمہ رائج ہے۔ سوشل سکیورٹی کے لیے ادائیگیاں اجرتوں میں سے خود بخود کاٹ لی جاتی ہیں اور ریاستی نظام کو ادا کر دی جاتی ہیں۔

ریاست کی مداخلت اس طرح سے ہو گی کہ وہ ان لوگوں کے انشورنس پریمیم ادا کرے گی جو پریمیم ادا کرنے کے قابل نہیں۔ اس طرح ریاست ان لوگوں کی مالی مدد کرنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر توجہ دے گی جو اس کے مستحق ہیں اور خود کفیل شہریوں کو دست نگر نہیں بنائے گی۔ اس سے معقول فنڈز حاصل ہوں گے جو طبی سہولتوں کو بہتر بنانے کے کام آئیں گے۔ اس قسم کی بنیادی تبدیلی کے بغیر ریاستی سطح پر مہیا کی جانے والی طبی سہولتوں کا معیار پست ہوتا رہے گا۔ انہیں بہتر بنانے کے لیے فنڈز میسر نہیں ہیں۔

عوام قومی سطح پر اس نظام کو استعمال میں لاتے رہیں گے، اس لیے کہ اس پر لگانے کے لیے فنڈز مہیا ہوتے رہیں گے۔ اس کے علاوہ عوام کے پاس یہ اختیار بھی ہوگا کہ وہ چاہیں تو فری مارکیٹ میں قائم ہونے والے ہسپتالوں اور طبی سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں یا ریاستی طور پر مہیا کی جانے والی سہولتیں حاصل کریں۔

ان ہسپتالوں اور طبی سہولتوں میں توسیع ہوگی جن سے عوام مطمئن ہوں گے اور جن سے عوام ہی مطمئن نہیں ہوں گے انہیں اپنی کارکردگی کو بہتر بنانا ہوگا ورنہ وہ ختم ہو جائیں گی۔ آخر کار جیت عوام کی ہوگی۔

> ''آپ کو یہ یقین کیوں ہے کہ نجی بیمہ کمپنیاں اپنے وعدوں کو پورا کرنے کے قابل ہیں؟''

ریاست کے لیے ایک دوسری ذمہ داری ہے۔ اسے اس بات کو یقینی بنانا چاہئے۔ نجی بیمہ کمپنیوں میں سرمایہ کاری اطمینان بخش ہے اور ان کے انتظامی امور احتیاط سے چلائے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ صنعتوں کے لحاظ سے بیمہ کا نظام ہونا چاہیے جو ہر بیمہ دار کے ساتھ کئے گئے وعدوں کو پورا کرنے کی ضمانت مہیا کرے۔

> ''بہت سے لوگ طبی سہولتوں تک یکساں رسائی پر یقین رکھتے ہیں۔ آپ نے جو نظام تجویز کیا ہے، کیا اس سے طبی سہولتوں کے وہ درجے پیدا نہیں ہو جائیں گے، یعنی ایک امراء کے لئے اور دوسرا غرباء کے لیے؟''

میں جو نظام تجویز کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ امراء اپنے علاج معالجے پر خود خرچ کریں جب کہ غریب لوگ کمیونٹی سے مدد حاصل کریں۔ دونوں کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ سرکاری یا نجی ہسپتالوں اور طبی سروسز سے اپنا علاج کرائیں۔ یہ ہر معاشرے کی اپنی سوچ ہے کہ وہ طبی سہولت کی کم از کم سطحوں کا تعین کرے جو وہ اپنے لوگوں کو دینے کی خواہش کرتا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔

''دواؤں اور طبی سہولتوں کی قیمت کو کنٹرول میں کیسے رکھا جا سکے گا؟''

دواؤں سے ابتدا کرتے ہیں۔ عام بات تو یہ ہے کہ قیمتوں کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے دو مختلف نظام موجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ حکومت اپنا اختیار استعمال کرتی ہے اور دوسرا وہ کنٹرول ہوتا ہے جو آزاد منڈی میں مقابلے کے رجحان سے پیدا ہوتا ہے۔ اس قسم کی مارکیٹ میں بہت سے پروڈیوسروں کے درمیان ہونے والا جائز مقابلہ خود بخود انہیں معیار اور قیمت میں مقابلے پر مجبور کرتا ہے۔ یہی نظام امریکہ، برطانیہ اور دوسرے بہت سے ممالک میں رائج ہے جو آزاد منڈیوں پر یقین رکھتے ہیں۔

بدقسمتی سے دواؤں کے معاملے میں یہ تصور غلط ہے مارکیٹیں آزاد نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس اجارہ دارانہ ہیں۔ پروڈیوسر آزادانہ طور پر کام کرنے کے قابل نہیں اور ایک دوسرے سے مقابلہ نہیں کرتے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کوئی ادارہ جو نئی دوا تیار کرتا ہے، وہ اس کے لیے خصوصی استحقاق حاصل کر لیتا ہے اور اس طرح اس کی اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے۔

خصوصی استحقاق رکھنے والے کو آزادی ہے کہ وہ جس قیمت پر چاہے اپنی دوا فروخت کر سکتا ہے۔ اگر دوا کی خصوصیات بے مثال ہیں اور مثال کے طور پر کسی خاص اور مہلک بیماری کے علاج کے لیے بہترین دوا ہے تو پھر آپ اسے ہر قیمت پر خریدنے کے لیے مجبور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دواؤں پر منافع کی شرح ناقابل تصور حد تک زیادہ ہے۔

اس قسم کے منافعوں کو صحیح قرار دینے کے لیے وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ریسرچ کا صحیح معاوضہ نہ دیا گیا تو ریسرچ رک جائے گی اور اگر ایسا ہوا تو پھر لوگ طب کے میدان میں نئی دریافتوں سے فیض یاب ہو پائیں گے۔ یہ صحیح ہے لیکن ایک حل موجود ہے جس سے ریسرچ کے کام کو آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ عوام کے اور نیشنلائزڈ ہیلتھ سروسز کی صورت میں ریاست کے بے محابا اختیارات ختم کرنے میں مدد ملے گی۔

خصوصی استحقاق کا سلسلہ جاری رہے گا۔ جب کوئی نئی دوا تیار ہو گی تو اس کے بنانے والے کو خصوصی استحقاق دیا جائے گا لیکن دوائیں تیار کرنے والے اصلی مینوفیکچر کو خود بخود یہ حق مل جائے گا کہ وہ اس دوا کو بنانے والے سے نئی دوا تیار کرنے کا لائیسنس حاصل

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرے اور اس کے معاوضے میں وہ دوا لانے والے کو متعین رائلٹی ادا کرے گا۔ دوسرے لفظوں میں تخلیق کار کو اس کی تخلیق خریدنے پر عوام جو فنڈز خرچ کریں گے ان میں اسے ٹھیک ٹھاک حصہ ملے گا۔

اس طرح تحقیقی کام کا صحیح معاوضہ بھی ملے گا اور تحقیقی کام کرنے والوں کو تحریک بھی ملتی رہے گی اور مارکیٹ میں صحیح معنوں میں مقابلہ کا رجحان بھی پیدا ہوگا۔ بہت سے مینو فیکچرز یہ نئی دوا تیار کر سکیں گے اور وہ سب اس کے خالق کو یکساں فیصد تناسب سے رائلٹی ادا کریں گے، اور یہ مینوفیکچررز معیار اور قیمت پر ایک دوسرے کا مقابلہ کریں گے۔ اس کے نتیجے میں دواؤں کی قیمت میں تیزی کے ساتھ کمی آئے گی۔ ریاست دواؤں کے کم از کم معیار کا تعین کرنے کی ذمہ دار ہوگی جس کا سبھی احترام کریں گے۔ اس طرح مارکیٹ کی آزادی میں گروہی سطح پر رکاوٹیں پیدا نہیں کی جا سکیں گی۔

''طبی خدمات کی قیمتوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

بیمہ کمپنیوں کی طرف سے پڑنے والی عمومی تجارتی دباؤ سے قیمتوں پر کسی حد تک کنٹرول ممکن ہوگا۔ مزید برآں جیسا کہ جرمنی میں ہے، شعبہ طب کے حکام قیمتوں سے متعلق رہنما اصول تیار کریں گے۔ آخری بات یہ کہ طبی خدمات چونکہ بے حد اہم ہیں اس لیے ثالثی کا ایک نظام قائم کرنا پڑے گا، جس کے تحت بیمہ کرنے والوں اور طبی خدمات فراہم کرنے والوں کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات طے کیے جائیں گے۔

''تعلیم کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''

صحت کے بارے میں جو اصول بتائے گئے ہیں وہی اصول تعلیم کے لیے بھی صحیح ہیں۔ دونوں کی بنیاد معاونت اور تفاوت پر ہونی چاہیے۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے تو اس میں ریاستی سکولوں پر خاندانی کنٹرول ایسے اقدامات کا ہونا ضروری ہے۔ تفاوت سے میری مراد یہ ہے کہ سکول بہت سی قسموں کے ہونے چاہئیں۔ وہ سکول جنہیں ریاست چلائے، میونسپلٹی چلائے، لوکل کمیونٹی چلائے، مذہبی ادارے چلائیں، ٹیچرز کوآپریٹو چلائیں، والدین کے کوآپریٹوز اور نجی ادارے چلائیں۔ اس سے والدین کو انتخاب کا موقع ملے گا۔ نتیجتاً جیسا کہ آزاد منڈی کا معمول ہے، جو سکول عوام کو مطمئن کر پائیں گے ان میں توسیع ہوگی اور جو عوام کو مطمئن نہیں کر سکیں گے وہ یا تو اپنی اصلاح کریں گے یا ختم ہو جائیں گے۔ ریاست

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خاندانوں کو واؤچرز مہیا کرے گی جو ان کی پسند کے سکول میں استعمال ہوں گے۔ واؤچرز مناسب قیمت کے ہوں گے تا کہ جب بہتر سکول انہیں کیش کرائیں تو انہیں اتنے فنڈز مہیا ہو جائیں جن سے وہ اپنا بہتر معیار بھی قائم رکھ سکیں اور انہیں جائز منافع بھی ملے۔

اس کے ساتھ ساتھ ریاست تعلیم، امتحانوں کے بنیادی درجوں اور سکولوں میں صحت وصفائی کے معیاروں کے قواعد تیار کرے۔ یہ قواعد ایسے ہوں جو معاشرہ کے لیے قابل قبول ہوں اور جب سکولوں کے درمیان مقابلہ ہو گا تو ان قواعد کو بہتر سے بہتر بنایا جاتا رہے گا۔

''کیا واؤچرز تمام خاندانوں کے لیے مفت ہوں گے؟''

یہ معاملہ ایسا ہے جسے ہر معاشرے کو خودنمٹانا ہو گا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں تو کہوں گا کہ غریب خاندانوں کے لیے واؤچرز مفت میں ہونے چاہئیں لیکن امراء کے لیے مفت نہیں ہونے چاہئیں۔ اہم بات یہ ہے کہ واؤچروں میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ اس بات کا خیال رکھا جانا چاہئے کہ اساتذہ سمیت کسی کو بھی یہ معلوم نہ ہو سکے کہ کون سا واؤچر مفت ہے اور کس کی ادائیگی کی گئی ہے۔

جہاں تک اعلیٰ تعلیم کا تعلق ہے، ریاست کو اس کی ادائیگی قرضوں کی صورت میں کرنی چاہئے۔ یہ قرضے طلبہ بعد میں ادا کریں گے۔ قرضوں کی ادائیگی کی شرح طلبہ کی آمدنی کے حساب سے متعین کی جائے۔ اگر اس قسم کا نظام اپنا لیا جائے تو اس سے کافی مقدار میں فنڈز مہیا ہو جائیں گے جو تعلیمی سہولتوں کو بہتر بنانے پر خرچ کیے جائیں گے۔

''تعلیم کے لیے آپ کے پاس کوئی اور سفارشات بھی ہیں؟''

میرے خیال میں یہ مناسب نہیں کہ زیادہ ذہین اور زیادہ صلاحیتوں کے مالک طلبہ کی آگے بڑھنے کی رفتار کو ان طلبہ کے ساتھ نفی کیا جائے جو ذہانت کے اوسط معیار پر پورے نہیں اترتے۔ یہ بات جہاں تعلیمی میدان کے لیے صحیح ہے وہیں کھیل اور آرٹس کے شعبوں میں بھی صحیح ہے۔

اس کے علاوہ میں اپرنٹس شپ پر بھی یقین رکھتا ہوں۔ تعلیم کو نظری وفکری مطالعہ کے ساتھ ساتھ عملی تجربے کی بنیادوں پر استوار کرنا چاہئے۔ میں بہت سے اچھے اور باصلاحیت اساتذہ کو جانتا ہوں جن میں ایک بہت بڑی خامی ہے اور وہ یہ کہ ان کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نظریات حقیقی دنیا سے لگا ؤ نہیں کھاتے۔

وہ استاد جو نظم و ضبط کو محض پڑھاتے نہیں بلکہ اس پر عمل بھی کرتے ہیں، وہ حقیقی دنیا میں اپنے تصورات اور نظریات کی مسلسل آزمائش کرتے رہتے ہیں اور اگر ان کے تصورات غلط ثابت ہو رہے ہوں تو پھر وہ فوری طور پر انہیں اس وقت تک تبدیل کرتے رہتے ہیں جب تک کامیاب سسٹم وجود میں نہیں آ جاتا۔ ایک نظریہ ساز اپنے نظریات ہی کی طرح ہے جو خود کو ہر فن مولا سمجھتا تھا اور یقین رکھتا تھا کہ وہ دنیا کا بہترین اور سب سے بڑا تیراک ہے۔ وہ میز پر لیٹے ہوئے تیراکی کے طریقے بتاتا ہے لیکن پانی میں کبھی نہیں اترتا۔

بہت سے مغربی معاشرے مستقل طور پر علم اور قیمتی ہنروں کو کھو رہے ہیں۔ ایک شاگرد کی حیثیت سے ہنر مند سے حقیقی علم سیکھنے کی بجائے ہمارے پاس ایسے طلبہ ہیں جو نظریہ سازوں سے نظریات سیکھ رہے ہیں۔ جرمنی نے اپرنٹس شپ کے وقار کو قائم رکھ کر اپنے یورپی مقابل ملکوں پر برتری حاصل کر لی ہے۔

''عالمی فلاحی ریاست کے مزید پہلوؤں سے متعلق کچھ فرمائیں گے؟''

ہمیں ابتداء کی طرف جانے اور اپنے مقاصد کا نئے سرے سے تعین کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں ریاست کی طرف سے فلاح و بہبود کا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کو تحفظ مہیا کیا جائے جو عارضی طور پر یا مستقلاً اپنی دیکھ بھال کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ یہ حاکموں کی تخصیص نہیں ہونی چاہئے کہ وہ پنگھوڑے سے قبر تک شہریوں کی فطری ذمہ داریوں کو پورا کریں۔ حکومت کی یہ ذمہ داری نہیں ہونی چاہیے کہ وہ کسی فرد کے خاندان کے لیے انفرادی ضرورت کو پورا کرے، اس کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس کا خیال رکھے اور صحت کی بیمہ کی ذمہ داری قبول کرے۔

جن ملکوں میں یہ ساری ذمہ داریاں حکومت کے اعمال سنبھال لیتے ہیں وہاں کی حالت ہم نے دیکھی ہے۔ سویڈن جیسی فلاحی ریاست کو دیکھیے، وہاں تمام ذمہ داریاں ریاست نے سنبھال رکھی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں وہاں ایک ایسا نظام وجود میں آ گیا ہے جس میں کام نہ کرنے والا بھی اتنا ہی کما لیتا ہے جتنا کام کرنے والا۔ نومولود بچوں کے والد ایک سال کی ولدیتی رخصت (Paternity Leave) اکثر لوگ طبی یا نفسیاتی بنیادوں پر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کام سے غیر حاضر رہ کر تنخواہ وصول کرتے ہیں اور یہ وہاں کا معمول بن کر رہ گیا ہے۔ ہالینڈ میں ایک چالاک کارکن تینتالیس سال کی عمر میں پوری تنخواہ کے ساتھ ریٹائرمنٹ لے سکتا ہے۔

جارج میسن یونیورسٹی کے پروفیسر والٹر ولیمز کا کہنا ہے کہ کارکنوں پر پیسے نچھاور کر کے ان کے بنیادی مسائل کو حل نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر وہ لکھتے ہیں کہ ''اس صدی کی چھٹی دہائی سے غربت ختم کرو'' پروگرام پر جو رقم خرچ کی گئی اس سے امریکہ کی 500 بڑی کمپنیوں کے تمام اثاثے اور امریکہ کی تمام زیر کاشت اراضی خریدی جا سکتی تھی۔ لیکن ہوا کیا؟'' مسائل وہیں کے وہیں ہیں بلکہ زیادہ گمبھیر ہو گئے ہیں۔

ہمارا مسئلہ صاف ہے۔ کئی دہائیوں سے ہم نے یہ سوچے سمجھے بغیر اپنا فلاحی نظام بنا لیا ہے کہ فلاح و بہبود کی ضرورت کیوں پیدا ہوئی یا ان لوگوں کی مدد سے کس طریقے سے کریں کہ ان لوگوں کی نہ تو اخلاقیات تباہ ہو اور نہ ہی ان کا معاشرہ برباد ہو۔ بعض اوقات مقصد کے لحاظ سے ہمارا عمل فیاضانہ ہوتا ہے لیکن زیادہ تر اس کا محرک سیاسی ضرورت اور کمزوری ہوتا ہے۔ ہمارے آج کے فلاحی نظام میں ہمارے معاشرے کی کمزوریاں شامل ہیں اور ہم انہیں دور نہیں کر سکے۔ ہم اپنی معاشرتی بے سمتی کی علامات کو تو کم کرتے ہیں لیکن اس کے بنیادی اسباب کو بڑھاتے ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب 5

جدید زراعت اور معاشرے کی تباہی

''آپ سمجھتے ہیں کہ بڑے پیمانے پر کھیتی باڑی، جس پر جدید زراعت کی بنیادیں استوار کی گئی ہیں، عوامی صحت کو برباد اور معاشرے کو غیر مستحکم کرتی ہے۔ کیوں؟''

ایسی کھیتی باڑی جس پر تمام تر انسانی و مادی وسائل استعمال کئے گئے ہوں، کی بنیاد اس نظریہ پر رکھی گئی ہے کہ خوراک بھی کسی دوسرے پراڈکٹ کی طرح ہے اور یہ کہ زراعت بھی ٹیکنالوجی کو ویسا ہی فائدہ دے گی جیسا صنعت دیتی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اگر نئی ٹیکنالوجی متعارف کرائی جائے تو اس سے کارکردگی میں اضافہ ہوگا اور پیداوار بھی بڑھے گی۔ دنیا بھر میں ایسے بڑے کھیتوں میں جہاں جدید مشینوں کے ذریعے کھیتی باڑی کی جا رہی ہو اور جن میں تازہ ترین سائنسی دریافتوں کا استعمال ہو رہا ہو، زیادہ خوراک پیدا ہوگی، جو زیادہ سستی ہوگی، جس سے معیشت اور لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ مزید دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس سے دیہی علاقوں میں روزگار کے جو مواقع ختم ہوں گے وہ فنی ایجادات کی وجہ سے صنعتی اداروں میں ختم ہونے والے روزگار کے مواقع سے مختلف نہیں۔ مزید برآں عورت اور مرد زمین سے آزاد ہو جائیں گے اور وہ عصر حاضر کی صنعت کے متحرک شعبوں میں حصہ لے سکیں گے جہاں وہ مجموعی قومی پیداوار کے اضافہ میں اپنا حصہ شامل کریں گے۔ اس طرح عام لوگ خوشحال ہو جائیں گے۔

بادی النظر میں تو یہ بات بالکل واضح ہے، لیکن ہے قطعی غلط۔ جب لوگ زمین

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چھوڑیں گے تو وہ کام کی تلاش میں شہروں کی طرف مائل ہوں گے۔ دنیا بھر میں شہروں میں روزگار کے مواقع کافی نہیں ہیں اور نہ ہی شہروں میں پانی، بجلی، گیس اور سڑکوں، سکول، ہسپتالوں اور گھروں کی کافی سہولتیں مہیا ہیں۔ نتیجہ بڑھتی ہوئی بیروزگاری کی شکل میں سامنے آئے گا۔ اس کے علاوہ فلاح و بہبود پر اخراجات کے ساتھ ساتھ سہولتیں فراہم کرنے کے لیے مناسب اخراجات کی ضرورت ہوگی۔ یہ بڑے پیمانے کی کھیتی باڑی پر اٹھنے والے بالواسطہ اخراجات ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور قیمت بھی ہے جو مخفی ہے۔ جب تبدیلی کے نتیجے میں کسی ایک خاص مدت میں روزگار ختم ہو جائیں تو معاشرے کا بنیادی توازن تبدیل نہیں ہوتا۔ چند تنزل پذیر کمپنیوں کو نقصان ہوتا ہے جبکہ مقابلہ کی قوت رکھنے والی کمپنیاں سامنے آ جاتی ہیں۔ لیکن دیہی علاقوں میں روزگار کے مواقع کا خاتمہ اور دیہات سے شہروں کی طرف آبادی کی منتقلی ایک بنیادی اور غیر متبدل تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔ دنیا بھر میں اس صورتحال نے دیہی معاشرے کو غیر مستحکم کیا ہے اور شہروں کی آبادیوں میں بے پناہ اضافہ کا باعث بنی ہے۔ شہروں کے کچے اور غلیظ علاقوں میں اپنی جڑوں سے اکھڑے ہوئے افراد کا جمگھٹا لگ جاتا ہے۔ جن کے خاندان بکھر گئے ہیں، جن کی ثقافتی روایات ختم ہوگئی ہیں اور جو محض ریاست کی خیرات پر زندہ رہتے ہیں۔ یہ لوگ ایک اجنبی ادنیٰ طبقہ تشکیل دیتے ہیں۔ ترقی یافتہ دنیا سے لے کر تیسری دنیا تک کے تمام بڑے شہر ایک المیہ اور روگ بن کر رہ گئے ہیں۔ اس سماجی توڑ پھوڑ کو آپ ناپ نہیں سکتے۔ یہ نقصان بنیادی ہے۔ دنیا بھر کے بڑے شہروں میں سماجی شکستگی آزاد معاشروں کے وجود کے لیے خطرہ بن گئی ہے۔

برازیل کے صاحب نظر سابق وزیر ماحولیات جوزے لٹز بنبر گر لکھتے ہیں ''برازیل کے بدنام گندے و غلیظ محلے، جو ''فاویلاز'' کے نام سے جانے جاتے ہیں وہ اس صدی کی پانچویں دہائی کے انقلاب سبز کے نتیجے میں دیہی آبادیوں کی منتقلی کی وجہ سے ظہور میں آئے۔ یہ بڑے پیمانے پر کھیتی باڑی کا پہلا تجربہ تھا جو بہت بڑے رقبے پر کیا گیا اور جہاں نئی سائنسی ایجادات کا استعمال کیا گیا۔ خیال تھا کہ اس سے پوری دنیا سے ہمیشہ کے لیے قحط کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔

''لیکن کیا آپ کو اس دعوے پہ اعتراض ہے کہ بڑے پیمانے پر زراعت زیادہ سود مند ہے؟''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑے کھیتوں سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے کہ لیبر (انسانی قوت) کو استعمال کیا جائے۔ اگر پیداوار کو فی ایکڑ کی اصطلاحات، یا فی یونٹ قوت یا لاگت کی اصطلاحات میں ناپا جائے تو پھر چھوٹا کھیت بہترین ثابت ہوگا۔

فی کس محنت کی مقدار اعلیٰ ترین ترقی یافتہ مغربی ممالک میں تو ایک اہم بات ہو سکتی ہے جہاں محنت کا معاوضہ زیادہ اور معیار زندگی بہت بلند ہے۔ لیکن ہم ایک نئی دنیا میں داخل ہو رہے ہیں جس میں ہمیں چار ارب افراد کو شامل کرنا ہوگا جو اچانک عالمی معیشت میں شریک ہوئے ہیں۔ ان میں چین، بھارت، ویت نام، بنگلہ دیش اور سابق سوویت یونین کے ممالک اور دوسرے بہت سے ممالک کے لوگ شامل ہیں۔ ان ممالک کی آبادیاں تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہیں اور پیش گوئی ہے کہ آئندہ پینتیس برسوں میں ان ممالک میں آبادیاں ساڑھے چھ ارب افراد تک پہنچ جائیں گی۔ ان نئے حالات میں سوال یہ نہیں رہا کہ لیبر کو کیسے بچایا جائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی آبادیوں کو کیسے مستحکم کیا جائے جبکہ ان کا بڑا حصہ بیروزگاری کا شکار ہے۔

ویت نام کی مثال لیجئے۔ اس کی آبادی سات کروڑ چالیس لاکھ ہے جس کا 80 فیصد حصہ دیہات میں رہتا ہے (جبکہ آسٹریلیا جو بڑا زرعی ملک ہے، کی آبادی کا 14.8 فیصد دیہات میں رہتا ہے)۔ ان لوگوں کو کھیتوں سے اٹھا کر شہروں کی گندی بستیوں میں دھکیل دینے سے تباہی نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا۔

پوری دنیا میں اس وقت تین ارب دس کروڑ دیہی علاقوں میں رہ رہے ہیں۔ اگر پوری دنیا پر زراعت کے جدید مشینی طریقے تھوپ دیئے جائیں اور فی کس پیداوار کو آسٹریلیا کے برابر لانا مقصود ہو تو جیسا کہ ہم بات کر چکے ہیں، ان میں سے تقریباً دو ارب افراد اپنے روزگار سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ پوری دنیا کی دیہی آبادیاں ایسے ختم ہو جائیں گی جیسے بڑے سیلاب میں بہہ گئی ہوں۔ تمام آبادیاں بے گھر ہو کر شہروں کی گندی بستیوں میں منتقل ہو جائیں گی اور جیسا کہ متاثرہ قومیں قابو میں نہیں رہتیں اور کنگال ہو جاتی ہیں، تو پھر ان کے لوگ کہیں اور پناہ لینے پر مجبور ہوں گے۔ اس سے بڑے پیمانے پر بے گھر لوگوں کی منتقلی شروع ہو جائے گی۔ اس کے باوجود معیشت دان تمام تر وسائل کے ذریعے خوراک کی پیداوار پر اٹھنے والی لاگت کا تخمینہ لگاتے وقت سماجی اور اقتصادی لاگت پر توجہ نہیں دیتے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جدید معاشرہ بڑے پیمانے پر کھیتی باڑی پر یقین رکھتا ہے۔ اس لئے کہ جدید کلچر طویل المدت اور زیادہ اہم نتائج کو سمجھنے کی کوشش کی جائے ناپ تول اور حساب کتاب پر مبنی ہے۔

''بڑے پیمانے کی کھیتی باڑی کے اور کیا اثرات ہیں؟''

ماحولیات اور عوام پر اس کے اثرات سے سبھی واقف ہیں۔ ان کے علاوہ زمین کا ٹکاؤ، کیمیاوی مادوں سے پیدا ہونے والی پانی کی آلودگی، زمین کے اندر کے پانی کا تیزی کے ساتھ اخراج، جینیاتی رنگا رنگی کی تباہی، خوراک کی آلودگی اور عوامی صحت کی بربادی بڑے پیمانے کی کھیتی باڑی کے نتائج ہوں گے۔

''بڑے پیمانے کی کھیتی باڑی سے حاصل ہونے والی خوراک کے عوامی صحت پر اثرات کا آپ کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ کے ذہن میں کیا ہے؟''

جانوروں کی انتہائی نگہداشت کے ساتھ پرورش کا مقصد یہ ہے کہ کم سے کم مدت میں کم سے کم لاگت کے ساتھ وہ بہت زیادہ وزنی ہو جائیں۔ اس طرح وزن تو بھاری ہو جاتا ہے لیکن قوت میں اضافہ نہیں ہوتا اور یہ کام لحمیات کی بجائے چربی پیدا کر کے آسانی سے پورا کیا جاتا ہے۔ اس وقت مرغیوں، فیل مرغوں، بطخوں، سوروں، بچھڑوں اور گائیوں وغیرہ کی پرورش انتہائی نگہداشت کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اب تو سامن مچھلی، ٹراؤٹ، بڑی مچھلی اور دوسری مچھلیوں کی بھی اس انداز سے پرورش شروع کر دی گئی ہے۔

میں گوشت کی مثال لیتا ہوں جو پہلی مرتبہ جدید فیکٹری فارمنگ کے ذریعے حاصل کیا گیا۔ مرغیوں، برائلرز کی پرورش شیڈ (سائبان) میں کی جاتی ہے۔ ہر سال آٹھ مرتبہ فصل لی جاتی ہے۔ سو ہر سال آٹھ مرتبہ ایک یا دو روزہ چالیس ہزار چوزے ہیچری کے انکوبیٹرز سے شیڈ میں بھیجے جاتے ہیں۔ یہ اس وقت تک وہاں رہتے ہیں جب تک حلال ہونے کے قابل نہیں ہو جاتے اور اس میں 42 دن درکار ہوتے ہیں۔ ان کی خوراک میں قدرتی سبزی کا مواد بہت کم ہوتا ہے، اس کے بجائے اس میں مچھلی کے گوشت اور ہڈیوں سے تیار کیا ہوا مادہ ہوتا ہے۔ حقیقت میں خوراک وہ ہے جو ان سے پہلے کے پرندوں سے تیار کی جاتی ہے۔ اکثر ان کی خوراک میں ایسے اجزا شامل کر دیئے جاتے ہیں جو انکی جلد

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پرورش کا باعث ہوتے ہیں یعنی اینٹی بائیوٹیکس (ورجنیا مائی سین) اور اینٹی کوکی ڈائلز جو چھوت کی بیماری میں مفید ہوتی ہے۔ جلدی تیار کئے جانے والے جانوروں کو اینٹی بائیوٹیکس دینے سے ان کے وزن میں شاید پانچ فیصد اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح دوسرے جانوروں پر بھی اس قسم کا صنعتی قسم کا عمل دوہرایا جاتا ہے۔

تیزی کے ساتھ تیار کئے جانے والے جانور اپنی ہی نسل کے ان جانوروں سے مختلف ہوتے ہیں جن کی پرورش قدرتی طور پر ہوتی یا کی جاتی ہے۔ قدرتی طور پر تیار ہونے والے جانوروں کے جسموں میں چربی کی نسبت لحمیات کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ جبکہ مشینی طریقے سے پرورش پانے والے جانوروں کے جسموں میں لحمیات کی نسبت چربی کا تناسب کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اگر کیلوریز کے حوالے سے دیکھا جائے تو مشینی طریقے سے پرورش پانے والے جانوروں میں لحمیات کی نسبت پر چربی کی مقدار نو گنا زیادہ ہوتی ہے۔ مرغیوں میں گزشتہ صدی کے آخر سے اب تک چربی کی مقدار میں ایک ہزار فیصد اضافہ ہوا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ چربی کی تین اقسام ہوتی ہیں جن میں سے دو کا ہم سے گہرا تعلق ہے۔ ایک پولی ان سچورٹیڈ اور دوسری سچورٹیڈ۔ پولی ان سچورٹیڈ چربی میں ضروری روغنیاتی تیزاب ہوتے ہیں۔ یہ اس لئے لازمی ہوتے ہیں کہ ان سے دماغ کی پرورش اور اس کے بڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ روغنیاتی تیزاب دماغ کے تمام خلیوں کو موثر طور پر کام کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان سے ہارمون جیسے مادے پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے جو رگ دار نظام کو نظم و ضبط میں لاتے ہیں۔ دوسری طرف سچورٹیڈ روغنیات امراض قلب کا باعث بنتی ہیں اور غالباً چھاتی اور بڑی آنت کے کینسر کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ چنانچہ اس سے ہماری خوراک کو دوہرا نقصان پہنچتا ہے۔ ایک تو یہ کہ گوشت میں لحمیات کی نسبت چربی زیادہ ہوتی ہے اور دوسرا یہ کہ اس چربی کی کوالٹی بھی گھٹیا ہوتی ہے۔

اب آگے چلئے۔ محدود سی جگہ جہاں جانور رہتے ہیں وہاں جرثوموں کی ترسیل ہوتی رہتی ہے جس کی وجہ سے چھوت کی بیماریاں تیزی کے ساتھ پھیلتی ہیں۔ غیر فطری حالات جن میں یہ جانور رہتے ہیں، جانوروں کی صحت کو نقصان پہنچاتے اور بیماری کے خلاف ان کی قوت مزاحمت کو گھٹاتے ہیں اور چونکہ یہ جانور ایک ہی جینیاتی طریقے سے پیدا ہوتے اور پرورش پاتے ہیں اس لئے وہ ایک ہی قسم کی بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں متعدی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

امراض کو روکنے کے لیے ویکسین، اینٹی بائیوٹیکس اور دوسری ادویات استعمال کرائی جاتی ہیں جس سے عمومی طور پر مقابلہ کرنے والا بیکٹریا پیدا ہو جاتا ہے جو پھر انسانوں میں بھی پھیلتا ہے۔

''کیا میڈ وہکاؤ ڈیزیز (جانوروں میں پائی جانے والی شدید نوعیت کی بیماری) بھی جانوروں کی غیر فطری پرورش کا نتیجہ ہے؟''

میڈ کاؤ ڈیزیز یا بودین سپنجی فارم اینسی فیلوپیتھی (بی ایس ای) چھوت کی بیماریوں کے گروہ کا ایک رکن ہے جو ٹی ایس ای (ٹرانسمی زیبل سپنجی فارم اینسی فیلوپیتھی) کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ ٹی ایس ای جو بھیڑوں کو متاثر کرتی ہے، سکریپائی کہلاتی ہے اور اس کی وہ شکل جو انسانوں کو متاثر کرتی ہے کہ کروز فیلٹ جیکب کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بیماریاں ہمیشہ جان لیوا ہوتی ہیں اور ان کا کوئی علاج نہیں ہے۔ یہ دوسری جنسوں میں منتقل ہوتی ہیں اور بڑی دیر تک رہتی ہیں اور بیماری کی علامات ظاہر ہونے سے بہت پہلے ہی سے جانوروں کے جسم کے پٹھوں میں اس کے جراثیم موجود ہوتے ہیں۔ یہ بیماری چھوتی کارندوں کے ذریعے منتقل ہوتی ہے جس کے کیمیاوی عناصر ابھی تک دریافت نہیں ہو سکے۔ یہ بہت چھوٹے ہوتے ہیں، تمام کلاسیفائڈ وائرس سے بھی چھوٹے اور جب تک علامات ظاہر نہ ہوں، بیمار جانور کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ جانوروں کے جسم سے مادہ لے کر چوہوں کے جسموں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ پھر بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے باوجود ایک سال تک اس کا پتہ ہی نہ چلے۔

چھوتی کارندے غیر معمولی طور پر سخت جان اور حدت کا مقابلہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ تجربات سے ظاہر ہوا ہے کہ یہ ایکسریز یا اریڈی ایشن، اینٹی سپٹکس یا اینزائمز یا فارمل ڈی ہائیڈ کی خوراک دینے سے بھی نہیں مرتے۔ 360 ڈگری سنٹی گریڈ کی حدت میں ایک گھنٹہ تک رکھنے پر بھی یہ ختم نہیں ہوتے۔ یہ ان حالات میں بھی ختم نہیں ہوتے جن میں تمام دوسرے معلوم چھوتی کارندے مر جاتے ہیں۔ یہ دیر پا ہیں اور کئی برس تک مٹی میں موجود رہتے ہیں۔ گھروں میں کھانا پکانے کے دوران کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔

ٹی ایس ای دودھ پلانے والے جانوروں پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن دوسرے جانوروں پر نہیں (البتہ شتر مرغ اس سے متاثر ہوتے ہیں)۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ جب ٹی ایس ای ایک جانور سے دوسرے جانور میں منتقل ہوتا ہے تو چھوتی کارندے کی خصوصیات تبدیل ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایسا لگتا ہے جیسے سکریپائی بھیڑ سے کم لمبی دم والے چھوٹے بندر میں براہ راست منتقل نہیں کی جاسکتی اور اس بندر انسان ان کے جینیاتی تعلق کی بنا پر سکریپائی انسان کو براہ راست متاثر نہیں کرتی لیکن سکریپائی کو اگر تجربے کے طور پر بھیڑ سے چھوٹی ٹانگوں والے چھوٹے جانور منک میں منتقل کیا جائے تو پھر سے منک ٹی ایس میں نئی خصوصیات پیدا کرتا ہے اور پھر اسے چھوٹے بندروں میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ٹی ایس ای کو بلاواسطہ یا بالواسطہ ایک سے دوسری قسم کے جانور میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔

پہلی مرتبہ 1986ء میں بی ایس ای کے مریضوں کا پتہ چلا۔ بہت سے سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ چھوت کے کارندے ایسے چارے کے ذریعے گایوں میں منتقل ہوئے جو چارہ مردہ جانوروں کے اعضا سے فیکٹریوں میں تیار کیا جاتا ہے۔ یہ فیکٹریاں جو مواد پیدا کرتی ہیں وہ جانوروں کی خوراک میں شامل ہو جاتا ہے جس سے جانوروں کی چربی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس طرح ہم گایوں کا بچا کھچا گایوں ہی کو کھلا رہے ہوتے ہیں۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس صدی کے پہلے نصف میں ٹی ایس ای کی دوسری شکل تھی جو انسانوں پر اثر انداز ہوتی تھی، اس بیماری کا نام ''کرو'' تھا۔ یہ بیماری پتھر کے زمانے میں خور قبیلہ میں پائی جاتی تھی جو آدم خور تھا۔

''جب بی ایس ای ظاہر ہوئی تو برطانوی حکام نے کس قسم کے ردعمل کا اظہار کیا؟''

حکومت نے خود کو ایک بہت ہی مشکل صورتحال میں پایا۔ ثبوت بہت ہی کمزور تھا اور خطرات اگرچہ بڑے تھے لیکن ان کی تصدیق نہیں ہوئی تھی۔ چونکہ انڈے سینے کا عرصہ خاصا ہوتا ہے اس لئے یہ تعین کرنے میں چند سال لگیں گے کہ آیا چھوت کی بیماری گایوں سے انسانوں میں پھیل سکتی ہے یا نہیں۔ حکومت کی طرف سے غیر معمولی اقدامات یا مکمل تیاری کے باعث خوف و ہراس پیدا ہوسکتا تھا اور برطانوی فارمنگ پر اس کے خاصے تباہ کن اثرات مرتب ہوتے۔ چنانچہ حکومت نے مشاورتی سائنسی کمیٹیاں قائم کر کے اور عوام کی ہمت بندھانے کے لیے احتیاطی اقدامات کے ذریعے اپنا ردعمل ظاہر کیا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

1989ء میں ذبح کئے جانے والے جانوروں میں سے زیادہ خطرے والے اعضاء الگ کئے جاتے تھے۔ یہ ایک اچھا فیصلہ تھا جو ہوسکتا ہے کہ مفید یا مکمل طور پر غیر مفید ثابت ہوتا اس لئے کہ یہ ثابت نہیں ہو پایا تھا کہ جانور کے کن نسوں یا رگوں میں وبائی مرض پیدا کرنے والے ایجنٹ موجود ہیں۔ مثال کے طور پر تمام اعضاء اور گوشت میں نسیں ہوتی ہیں جو دماغ کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ متعدد وبائی مرض پیدا کرنے والے ایجنٹ کس جانور کے بیرونی اعضاء اور دماغ کے درمیان نسوں کے ساتھ ساتھ گزرتے ہیں۔ اس لیے اگر دماغ میں بیماری کے جراثیم میں داخل ہو کر اسے متاثر کر سکتے ہیں تو نسیں بھی متاثر ہوتی ہیں۔

مزید برآں یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ جانور جن کے بارے میں شبہ ہو کہ وہ بی ایس ای سے متاثرہ ہیں، ان کے بارے میں فوری طور پر اطلاع دی جائے۔ ادھر بیمار گائیوں کے دودھ کی فروخت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ یہ مفید تھا لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے، کوئی ایسا طریقہ نہیں تھا جس سے یقین ہو سکے کہ بیمار جانوروں کا پتہ چل سکے گا۔ بیماری کا علم آخری وقت پر ہوتا تھا۔ چنانچہ حکومتی اقدام محدود ہو کر رہ گیا۔

کمیٹیوں نے جگالی کرنے والے جانوروں کے خون اور گوشت کی بنیاد پر تیار کئے گئے پروٹین والے چارے پر پابندی عائد کرنے کی سفارش کی۔ دوسرے لفظوں میں جگالی کرنے والے جانوروں پر اپنی ہی نسل کے جانوروں کو کھانے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ یہ بہترین فیصلہ تھا لیکن یہ پابندی سوروں اور مرغیوں پر نہیں لگائی گئی۔ بہرحال اس سفارش کے اثرات کو جانچنے کے لیے ضروری ہے کہ بی ایس ای کے جراثیم کا گایوں سے ان کے بچھڑوں میں منتقل ہونے کے عمل کا جائزہ لیا جائے۔ اگرچہ حکومتی سائنس دان اسے تسلیم نہیں کرتے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ بی ایس ای گایوں سے بچھڑوں تک منتقل ہو رہی ہے اور جب تک کوئی حفاظتی تدابیر اختیار نہیں کی جاتیں، ایسا ہوتا رہے گا۔

فروری 1989ء میں حکومتی سربراہی میں کام کرنے والی ساؤتھ ووڈ کمیٹی نے جو نتائج اکٹھے کئے ان میں سے ہم ترین یہ نتیجہ تھا، ''موجود شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مویشی بیماری کے ایجنٹ کے لیے ڈیڈ اینڈ ہوسٹ (Dead end Host) ہوں گے اور اس کا امکان نہیں ہے کہ بی ایس ای انسانی صحت کے لیے الجھاؤ پیدا نہیں کرے گا۔ باوجود اس

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے اگر ان احکامات کے بارے میں ہماری جانچ غلط ثابت ہوئی تو اس کے اثرات بہت گہرے ہوں گے۔" ڈیڈ اینڈ ہوسٹ کا مطلب ہے کہ بی ایس ای یہاں رک جائے گا اور گائے سے دوسرے مویشیوں میں منتقل نہیں ہوگا۔

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ نتیجہ صحیح تھا؟"

ساؤتھ ووڈ رپورٹ کو شائع ہوئے پانچ سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے اور متعدی مرض پیش گوئی سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلا ہے۔ کمیٹی نے پیش گوئی کی تھی کہ بیس ہزار مویشی متاثر ہوں گے لیکن یہ اعداد وشمار بڑھ کر ایک لاکھ تیس ہزار سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ برطانیہ کے تیس ہزار فارمز میں کم از کم ایک جانور کو ضرور یہ بیماری لگی ہے۔ (فارمز کی یہ تعداد برطانیہ کے کل فارمز کا 52 فیصد ہے) یارک ڈسٹرکٹ ہسپتال کے شعبہ مائیکرو بیالوجی کے ڈاکٹر سٹیفن ڈیلر کے مطابق یہ تعداد متاثرہ مویشیوں کا 20 فیصد ہے جبکہ باقی مویشی تشخص سے پہلے ہی کھائے جا چکے تھے۔

مزید برآں، بی ایس ای سے متاثرہ اٹھارہ میں سے سترہ دودھ پلانے والے مختلف جانوروں کو بیماری منتقل ہوئی۔ ان میں چوہے، ہرن، مینڈھے اور بلی کے علاوہ سور اور بندر شامل ہیں۔ سور میں بیماری کی صورت اہم ہے اس لئے کہ سور کی رگیں انسانی رگوں کی طرح ہوتی ہیں (سور کی بہت سی ملانے والی رگیں انسانی جسم میں پیوند کی گئی ہیں)۔ بندروں میں بیماری کی منتقلی پریشان کن ہے اس لئے کہ بندر انسان سے بے حد مشابہہ ہے۔ لیڈز یونیورسٹی کے شعبہ مائیکرو بیالوجی کے پروفیسر رچرڈ لیسی کے مطابق حکومت کی یقین دہانی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ بی ایس ای انسان کے لیے خطرناک نہیں اس لئے کہ وہ پھیل نہیں سکتی۔ مویشیوں کی افزائش نسل کرنے والے دو افراد کو تو "کروٹز فیلٹ۔ جیکب" کا مرض یعنی انسان کو ہونے والا ٹی ایس ای، لگ گیا اور یہ دونوں کیس خاصے مشہور ہوئے۔ ایک سولہ سالہ لڑکی بھی اسی مرض سے مر رہی ہے جس کے اسباب ابھی تک ڈاکٹروں کو پتہ نہیں چل سکے۔

برطانیہ کے علاوہ کینیڈا، فرانس، جرمنی، آئرلینڈ، پرتگال اور ڈنمارک میں بھی بی ایس ای کی نشاندہی ہو چکی ہے اور خیال ہے کہ ان ملکوں میں یہ وبا برطانیہ سے درآمد کئے گئے مویشیوں سے پھیلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جرمن حکومت نے برطانوی گوشت کی حفاظت

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے بارے میں سوال اٹھایا ہے۔ اس مسئلے پر جرمنوں نے حفاظتی راہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ جرمنی کے وزیر صحت ہارس سی ہوفز نے کہا کہ ''ہم محض اس نعرے کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتے کہ چونکہ کوئی سائنسی علم نہیں ہے اس لئے ہمیں اس کے بارے میں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب یورپی کمیشن نے کچھ نہیں کیا تو جون 1994ء میں جرمنوں نے برطانیہ سے گائے کے گوشت کی درآمد پر چھ ماہ کے لیے یکطرفہ طور پر پابندی عائد کر دی۔ حالانکہ جرمنی کے اس اقدام پر اس کے خلاف یورپی عدالت انصاف میں مقدمہ چل سکتا ہے۔ آخر کار اس اقدام پر یورپی یونین کو جھرجھری آئی اور 18 جولائی 1994ء کو طے ہوا کہ مویشیوں کے مردہ جسموں کی برآمد کے بارے میں یورپی یونین کے قواعد وضوابط میں، ترمیم کی جائے۔ اب برطانوی کاشتکاروں کو ضمانت دینی ہوگی کہ یورپی یونین کے رکن ممالک کو برآمد کیا جانے والا گوشت ان جانوروں کا نہیں جنہیں گزشتہ چھ برس کے دوران بی ایس ای کی وبا، لاحق ہوئی ہو۔ پہلے یہ مدت دو سال تھی لیکن یہ مدت اس بیماری کی شناخت کے لیے کافی نہیں تھی۔

> ''کیا صرف یہی واقعات ہیں یا بڑے پیمانے کی کاشتکاری کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اور مسائل بھی ہیں؟''

بڑے پیمانے پر زراعت کی نئی سرحد بائیوٹیکنالوجی ہے جس میں جینیاتی کارستانی بھی شامل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے چند اچھے اور غیر متوقع نتائج سامنے آئیں گے۔ بائیوسینتھٹک بووین گروتھ ہارمونز کی کہانی اس کی ایک اچھی مثال ہے جس میں زراعت کے لیے استعمال ہونے والی مصنوعات کو جانچا جاتا اور کاشتکاروں اور لوگوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ کیمیکل انڈسٹری نے اس چیز کا نام تبدیل کر کے بوون سوماٹوٹروپن یا بی ایس ٹی رکھ دیا ہے اور اس کا مقصد شاید لفظ ہارمون کو ختم کرنا ہے جو لوگوں کے ذہنوں میں شبہات پیدا کرتا ہے۔

بنیادی طور پر انڈسٹری نے دعویٰ کیا کہ بی ایس ٹی گائے کے دودھ میں مناسب اضافہ کرنے کا باعث ہوگی اور اس کی وجہ سے دودھ میں ہارمونز کی سطح میں اضافہ نہیں ہوگا اور نہ ہی گائے کی صحت پر کسی قسم کے منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ دعویٰ یہ ہے کہ اس طریقے سے لیا گیا دودھ انسانی صحت کے لیے بے خطر ہے۔ بی ایس ٹی کے استعمال کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک اور خوبی یہ گنوائی جاتی ہے کہ اس کے لیے کم سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

امریکہ کے محکمہ خوراک اور ڈرگ ایڈمنسٹریشن اور برطانوی حکومت کا ابتدائی ردعمل مثبت تھا۔ برطانوی زراعت نے تو یہ تک کہا کہ "یہ خیال کہ برطانیہ کو ایک طرف ہو جانا چاہئے اور دوسروں کو جدید طریقے سے دودھ پیدا کرنے کی اجازت ہونی چاہئے، قطعی بے مغز ہے۔ انسانوں کو پہنچنے والے نقصان کے بارے میں کسی کو شک وشبہ نہیں۔ یہ مکمل طور پر بے خطر ہے۔" بہرحال بہت سے لوگوں نے اس کی مخالفت کی اور زیادہ ادویات کے استعمال کے ذریعے گایوں کو اعلیٰ کارکردگی کی مشینیں بنانے پر سخت اعتراضات کئے۔ معترضین کے موقف کو اس وقت بہت زیادہ تقویت حاصل ہوئی جب دستاویزات یونیورسٹی الینوا میڈیکل سنٹر کے آکوپیشنل لینڈ اینوائرنمینٹل میڈیسن کے پروفیسر سموئیل ریپٹین کو پہنچیں حق میں بی ایس ٹی کے ان ٹیسٹوں کے نتائج تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں جو منسانٹو کیمیکل گروپ کی لیبارٹریوں میں کئے گئے تھے۔ دستاویزات کے کچھ حصے درج ذیل ہیں:

دودھ میں سوماٹوٹروپن کی مقدار میں جو نمایاں اضافے سامنے آئے ان کی سطح وہ تھی جو پانچ مرتبہ علاج کے بعد پیدا ہوسکتی ہے سوماٹوٹوپن، بی ایس ٹی میں موجود سینتھیٹک ہارمون کو کہتے ہیں جو دودھ میں نہیں ہونا چاہیے۔

ایسے جانوروں جنہیں ادویات نہ دی گئی ہوں، کا مقابلہ ان جانوروں سے کیا گیا جنہیں ادویات دی گئی ہوں، تو پتہ چلا کہ بی ایس ٹی کے استعمال والے جانوروں میں دباؤ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے مادے کے دائیں غدود سوجے ہوئے تھے۔

ادویات کھانے والے مویشیوں کے بائیں طرف والے مادے کا وزن نمایاں طور پر زیادہ تھا۔

اسی طرح ان مویشیوں کے دل کا وزن نمایاں طور پر زیادہ تھا۔

جگر کا وزن بھی زیادہ تھا۔

پھیپھڑے، بلغم اور بیضہ دان کا وزن بھی زیادہ تھا۔

مونسانٹو دستاویزات سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ ادویات کے استعمال والی گایوں کے خون میں عام گایوں کے خون کی نسبت قدرتی بی ایس ٹی کی مقدار بارہ سوگناہ زیادہ تھی۔

"یہ حقائق کیمیکل انڈسٹریز کے دعوؤں کی تردید کرتے ہیں۔"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بالکل، تردید ہوتی ہے۔ گورنمنٹ آپریشنز پر امریکہ کی کانگریس کمیٹی کے چیئرمین نے محکمہ صحت اور انسانی خدمات کے انسپکٹر جنرل کو جو خط لکھا اس کے کچھ مندرجات درجہ ذیل ہیں:

''خاص طور پر مجھے ان الزامات پر سخت دکھ ہوا ہے جن کا تعلق تنقیدی تحقیق انفامیشن سے ہے، جس کی فوڈ اینڈ ڈرگ ایڈمنسٹریشن اور مونسانٹو ایگریکچرل کمیشن نے سرکاری طور پر جانچ پڑتال نہیں کرنے دی۔ حالانکہ بوون گروتھ ہارمون کے تجارتی استعمال کے لیے یہ قدم ضروری تھا۔ انسانوں اور حیوانوں کی صحت پر اس کے منفی اثرات کا خیال نہیں رکھا گیا۔ فوڈ اینڈ ڈرگ ایڈمنسٹریشن اور مونسانٹو کی عوام کو یقین دہانیوں کے برخلاف انڈسٹری کی فلائلیں ظاہر کرتی ہیں کہ جن گایوں کو سینتھیٹک بوون گروتھ ہارمونز دیئے گئے، ان کے دودھ میں ہارمون کی سطح بہت زیادہ ہے۔ مزید برآں، مجھے اس پر بھی بے حد تشویش ہے کہ بوون گروتھ ہارمون کے انسانی تحفظ کے پہلوؤں سے متعلق تحقیق بہت ہی کم ہوئی ہے۔''

لیکن 5 نومبر 1993ء کو ایگروکیمیکل لابی کے دباؤ پر فوڈ اینڈ ڈرگ ایڈمنسٹریشن نے سر جھکا دیا۔ لیکن امریکی انتظامیہ کی ایک اور شاخ جنرل اکاؤنٹنگ آفس اور ریاست نیویارک میں صارفین کے تحفظ کے سرکاری انچارج کے دباؤ پر ایسا نہیں کیا جو یہ بات مسلسل کہہ رہے تھے کہ بوون گروتھ ہارمون انسانی صحت کے لیے مضر ہے۔

اپنے آپ کو قانونی چارہ جوئی سے محفوظ رکھنے کے لیے مونسانٹو نے خود ہی بی ایس ٹی کے متعلق جو اطلاعات بہم پہنچائی ہیں وہ خاصی تشویشناک ہیں۔ ان میں کہا گیا ہے کہ پوسی لیک کے استعمال سے گایوں کے اندر بہت سے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں جو بچھڑوں کی پیدائش میں خرابی کے ساتھ ساتھ گایوں کے دودھ میں ایسے جراثیم شامل کر لیتے ہیں جو انسانی صحت کے لئے انتہائی مضر ہیں۔ اس کے علاوہ مویشیوں کا ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے جس سے اسہال کی بیماری لگ جاتی ہے۔ مزید برآں مویشیوں کے گھٹنے اور پاؤں بھی صحیح نہیں رہتے۔

حکومت نے بی ایس ٹی کی جو منظوری دی اس پر عوامی ردعمل فوری نوعیت کا تھا۔ خوراک اور دودھ بیچنے والی متعدد دکانوں اور ایجنٹوں نے آلودہ پراڈکٹ بیچنے سے انکار کر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیا۔ مونسانٹو نے دودھ تقسیم کرنے والے ان چھوٹے چھوٹے اداروں پر اقدامات قائم کر دیئے جنھوں نے صارفین کو بتایا کہ ان کے دودھ میں بی ایس ٹی نہیں ہے۔ ان لوگوں نے یہ بات دودھ کی بوتلوں کے لیبلوں پر بھی چھپائی۔

مونسانٹو کے اس فیصلے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بی ایس ٹی کو مارکیٹ پر مسلط کرنے کے لیے کس حد تک جا سکتا ہے۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ مونسانٹو نے بی ایس ٹی کے استعمال سے معاشرے میں پیدا ہونے والے نتائج کا سرکاری سطح پر تحقیقی مطالعہ رکوانے کے لیے کافی سیاسی دباؤ بھی ڈالا۔ اگست 1994ء میں امریکہ کے محکمہ انصاف کو تحقیقات کرنے کی درخواست کی گئی۔

جہاں تک یورپی حکام کا تعلق ہے تو انہوں نے اپنی توجہ یہ جاننے پر مرکوز رکھی کہ آیا دودھ کی زائد پروڈکشن کے دنوں میں بی ایس ٹی کی ضرورت بھی ہے یا نہیں اور کیا ہارمون والے سستے دودھ کی فراہمی چھوٹے کاشتکاروں کو کاروبار سے الگ تو نہیں کر دے گی۔ جولائی 1993ء میں یورپی کمیشن نے بی ایس ٹی پر سات سال کے لیے پابندی لگانے کی سفارش کی۔ جس کی توثیق یورپی پارلیمنٹ نے کر دی۔ دسمبر میں پارلیمنٹ اس سے بھی آگے گئی اور اس نے یورپی یونین میں دودھ کی پیداواری سطحوں قطع نظر ایسے دودھ پر مکمل پابندی عائد کر دی۔ یہ پابندی اس دودھ پر بھی عائد کر دی گئی جو بی ایس ٹی کا استعمال کرنے والی گایوں کا تھا اور کسی بھی ملک سے درآمد کیا جاتا تھا۔ تقریباً انہی دنوں میں وزراء کی کونسل سے یورپی کمیشن اور یورپی پارلیمنٹ دونوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پابندی کی مدت سات سال سے کم کر کے ایک سال کر دی۔ ہوسکتا ہے کہ 1995ء کے آغاز میں مضر صحت دودھ پھر سے فروخت ہونے لگے۔

یورپی پارلیمنٹ کے نائب صدر ڈیوڈ مارٹن نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ آئین کی بے حرمتی ہے کہ وزراء کی کونسل اس طریقے سے کام کرے۔ خفیہ طور پر اجلاس کر کے ایسا فیصلہ کرنا، ظاہر کرتا ہے کہ وزراء کی کونسل نے اعلیٰ سطحی سرکاری مشیروں کے مشورے پر عمل کیا ہے جن کے صنعتی مفادات ہیں۔

برطانیہ اور بلجیم نے فوری طور پر اس بندش سے علیحدگی اختیار کرنا پسند کی۔ اس وقت کے برطانوی وزیر زراعت گیلین شیفرڈ نے دعویٰ کیا کہ بی ایس ٹی کی اجازت دینے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے بین الاقوامی تجارتی مسائل سے بچا جا سکے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا گیا کہ GATT کے تحت بی ایس ٹی پر کوئی بھی یورپی پابندی، چاہے وہ کتنی ہی عارضی کیوں نہ ہو، غیر قانونی ہو گی، اس لئے کہ یہ آزاد تجارت کے راستے میں رکاوٹ بنے گی اور چنانچہ اس وجہ سے دوا کو یورپ میں فروخت کیا جانا چاہئے۔ جو بات آپ کو بتائی ہے وہ آزاد تجارت کی برائیوں کی ایک مثال ہے جس نے معاشرے کی انتہائی بنیادی ضرورت یعنی انسانی صحت کو پرکاہ کی وقعت بھی نہیں دی اور یہ بات سیاستدانوں اور کاروباری مفادات کے درمیان پیدا ہونے والی سازش کا کھلا اظہار ہے۔

اس سازش کا ایک اور ثبوت وہ خط ہے جو وزارت زراعت نے ہاؤس آف کامنز یورپین سیلیکٹ کمیٹی کو بھیجا تھا۔ وزرات نے اپنی بات کی سچائی کے لیے میری سائیڈ میں سپیک کے ڈسٹا پراڈکٹس کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے کہ ''چالیس ملین پنڈ کی سرمایہ کاری کے ساتھ ساتھ ایک سو پچاس افراد کا روزگار خطرے میں پڑ گیا ہے۔ یورپی کمیشن کے خط (سات سالہ پابندی سے متعلق) کا مطلب ہے کہ ان پراڈکٹس کے لئے کافی حد تک مقامی اور ای سی ایکسپورٹ مارکیٹ حاصل نہیں ہو گی اور بی ایس ٹی پر عائد پابندی بائیوٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے سخت خطرہ ہو گی۔ اس سے سرمایہ رک جائے گی۔''

اس سے لگتا ہے کہ حکمرانوں کو دیہات میں ختم ہو جانے والے روزگار کے مواقع سے کوئی تعلق نہیں ہے جو بڑے پیمانے پر کاشتکاری کی وجہ سے ہوا ہے، بلکہ انہیں صنعتوں میں روزگار کے مواقع ختم ہونے پر تشویش ہے جن کا تناسب کہیں کم ہے اور نہ ہی انہیں عوام کی صحت پر مرتب ہونے والے خطرناک اثرات پر کوئی تشویش لاحق ہے۔

''کیا یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بائیوٹیکنالوجی کو مکمل طور پر مسترد کر دیا جانا چاہئے؟''

نہیں۔ طب انسانی میں، خصوصی امراض سے شفا حاصل کرنے کے ذریعہ کے طور پر بائیوٹیکنالوجی مفید ہو گی لیکن ہمیں اس کے فروغ پر خصوصاً سخت کنٹرول رکھنا چاہئے تاکہ بڑے حادثات سے بچا سکے۔ زراعت میں میرے خیال کے مطابق اس کے استعمال سے فائدے کی بجائے نقصانات زیادہ ہیں۔ آیئے بائیوٹیکنالوجی کی انتہائی غیر معمولی صورت کو لیتے ہیں یعنی جینیاتی انجینئرنگ کو جی ڈی این اے ٹیکنالوجی کے نام سے بھی جانی جاتی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ جینیاتی انجینئرنگ کا مقصد جینز کو ایک سیل سے دوسرے میں منتقل کرنا اور اس طرح زندگی کی نئی شکلوں کو تخلیق کرنا ہے۔ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ جینز کو ایک جنس سے دوسری جنس میں منتقل کر دیا جائے۔ مثال کے طور پر کینٹکی یونیورسٹی کے محققین نے ایک مچھلی کے جینز سویابین کے پودے کو منتقل کئے۔ دوسرے محققین نے انسانی نشوونما کے ہارمون کے جین کو سور میں منتقل کیا۔

زراعت میں جینیاتی انجینئرنگ پودوں، جانوروں، بیکٹیریا اور وائرس پر استعمال کی جاتی ہے۔ پودے کی حدود کو جینیاتی طور پر تبدیل کرنے کے نتائج بڑے دور رس ہیں۔ بائیوٹیکنالوجی کے حامی دعویٰ کرتے ہیں کہ جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعے تیار کئے گئے بیج ایسی فصلیں پیدا کریں گے جو پودوں کو تباہ کرنے والی دوا ہربیسائڈ کو برداشت کرسکیں گی اور خشکی، پالا، بیماری اور کیڑوں کا مقابلہ کرسکیں گی۔ یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ جینیاتی انجینئرنگ کے استعمال سے فصلوں کو کیمیاوی کھاد اور کیڑے مار ادویات کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بائیوٹیکنالوجی انڈسٹری کی لابی کے نتیجہ میں اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعے سے جانداروں میں جو تبدیلی ہوئی ہے اسے پیٹنٹ کرا لیا جائے۔ اب زندگی کی نئی شکلوں کو تجارتی اجارہ داریوں کو سرکاری طور پر تحفظ حاصل ہو جائے گا۔

یقیناً ایسے بھی ہیں جو اس صنعت کو ناقابل قبول خطرناک قرار دیتے ہیں۔ اس پر بحث ومباحثہ کرنا چاہیے اس لئے کہ یہ لوگ زمین پر موجود تمام تر حیات کے بنیادی عناصر کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعے تیار کئے گئے بیجوں کے خلاف بنیادی دلائل یہ ہیں:

1۔ یہ سبز انقلاب کا خطرناک اعادہ ہے جس کے ذریعے پانچویں اور چھٹی دہائی کے دوران ترقی یافتہ سائنسی طریقوں کے ذریعے زرعی عمل کو تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس وقت سینتھیٹک نامیاتی کیمیکلز کے لیے بڑا جوش وخروش پایا جاتا تھا۔ قدرتی خام موادکی جگہ سینتھیٹک نامیاتی کیمیکلز استعمال کئے جانے لگے۔ جینیاتی طور پر منتخب بیجوں پر کیمیکلز کا استعمال کر کے زیادہ فصل حاصل کی گئی۔ اس سے مونوکلچرز کو فروغ ملا۔ دوسرے لفظوں میں اراضی کے بڑے حصے کو ایک جیسے جینیاتی ماخذ کو صرف ایک فصل کاشت کرنے کے لیے مخصوص کرنا پڑا۔ اس کے نتیجے میں مشینوں کا استعمال

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بہت بڑھ گیا۔ اس کے علاوہ کیمیکلز اور استعداد کے استعمال میں مسلسل اضافہ ہونے لگا۔ رائٹ لائیولی ہوڈ ایوارڈ (نوبل پرائز کا متبادل) یافتہ فاؤلر اور مونی نے کہا ہے کہ ''زیادہ فصل حاصل کرنے کے لیے کھاد اور پانی چاہیے ہوتا ہے۔ کھاد اور پانی جڑی بوٹیوں اور فصلوں دونوں کی نشوونما کرتے ہیں جس کی وجہ سے ہری سائیڈز کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ کھادوں نے نئی اقسام کو ممکن بنایا۔ نئی اقسام نے کھادوں کو ضروری بنا دیا۔''

2۔ انڈسٹری کے دعوؤں کے برخلاف ہربی سائیڈ کو برداشت کرنے والے بیجوں کے استعمال کی وجہ سے اس بات کا امکان ہے کہ زیادہ اور مزید طاقتور ہربی سائیڈز کی ضرورت پیدا ہو جائے۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی میں ہونے والی حالیہ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ پھولوں کے ریزے (تخم) ایک ہزار میٹر فاصلے کے پودوں تک پہنچ جاتے ہیں اور جینز کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ رٹگرز یونیورسٹی کے ڈاکٹر ڈیوڈ اہرن فیلڈ کے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''چند فصلوں کے بعد ہم توقع کر سکتے ہیں کہ یہ پیدا کی گئی ہربی سائیڈ کی مزاحمت قدرتی طور پر کھیتوں میں جڑی بوٹیوں تک منتقل ہو جائے گی۔''

3۔ دنیا مسلسل تبدیلی ارتقاء اور سنجوگ کے عمل میں رہتی ہے۔ کیڑے اپنے اندر کیڑے مار دوائیوں کے خلاف مزاحمت پیدا کر لیتے ہیں، بلکہ اسی طرح جیسے جڑی بوٹیاں ہربی سائیڈز کے خلاف مزاحمت پیدا کرتی ہیں۔ امریکہ میں کیڑے مار دوائیوں کے استعمال میں دس گناہ اضافہ ہونے کے باوجود گزشتہ کئی برسوں کے دوران کیڑوں کی وجہ سے سالانہ فصلیں تباہ ہوئی ہیں۔

اسی طرح امراض پیدا کرنے والے ایجنٹ بھی نئے حالات میں ڈھل جاتے ہیں۔ نسبتاً کم وقت میں تبدل و انتقال انہیں اس قابل بنا دے گا کہ وہ جینیاتی انجینئرنگ کے ذریعے محفوظ کیئے گئے پودوں کے دفاعی نظام کو درہم برہم کر دیں اور چونکہ وہ جینیاتی طور پر ہم جنس ہیں اس لئے وہ انہیں امراض کا شکرا ہوسکیں گے۔ اس طرح تمام فصل ختم ہو جائے گی۔ سائنسدان یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ نئی تبدیل شدہ ساخت کیسی ہوگی اور پھر وہ کس طرح اثر انداز ہوگی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

4۔ غیر مجرب اور غیر ضروری زندہ نامیوں کے ماحول میں شامل ہو جانے پر کنٹرول کرنا کبھی ممکن نہیں ہو گا۔ 1986ء سے اس قسم کے رویہ کی متعدد مثالیں سامنے آ چکی ہیں۔

5۔ جینیاتی طور پر تیار کئے گئے مونو کلچرز کی نشوونما دنیا کے جینیاتی وسائل کی مزید تباہی کا سبب بنے گی۔ جینیاتی تفاوت قدرت کے عظیم تر خزانوں میں سے ایک ہے۔ بہت سال پہلے پودوں کے پتھالوجسٹ مارٹن وولٹ نے ماہر جینیات جون بیرٹ کے ساتھ کام کرتے ہوئے تصدیق کی تھی کہ پولی کلچر مونو کلچر سے زیادہ صحت مند ہوتے ہیں۔ ان دونوں سائنس دانوں نے بتایا کہ تین مختلف قسم کے جو کی آمیزش پھپھوندی کی سخت مزاحمت کرتی ہے جبکہ جو کی تین اقسام جب الگ الگ پیدا کی گئیں تو یہ اپنے اپنے طور پر پھپھوندی کی مزاحمت نہیں کر سکتی تھیں۔ اگر ایک بیماری ایک خاص قسم پر حملہ کرتی ہے تو دوسری قسم میں گھری ہوئی ہر نسل اپنے ہمسایوں کی مزاحمت کی وجہ سے محفوظ ہو جاتی ہے اور اگر وہ اکیلی ہو تو بیماری کے حملہ سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ ان دونوں سائنس دانوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایک مونو کلچر کسی ایک سال میں زیادہ فصل دے سکتا ہے لیکن پولی کلچر لمبے عرصے تک زیادہ فصل دے سکتا ہے۔

''جینیاتی تفاوت کی تباہی کے نتیجے میں کیا خطرات ہو سکتے ہیں؟''

تاریخ بہت سے ان تباہیوں سے آگاہ کرتی ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت دنیا میں آلو کی پانچ ہزار اقسام اگائی جاتی ہیں لیکن انیسویں صدی میں آئرلینڈ میں تمام آلوؤں کی طرف دو اقسام تھیں۔ جینیاتی حد کے نتیجے میں آلوؤں کی بیماری کی مزاحمت نہیں تھی جو متعدی وبا کی شکل اختیار کر گئی اور اس سے قحط پیدا ہو گیا۔

اس صدی کی چھٹی دہائی میں جنوبی علاقے میں اناج کی تباہی کے بعد امریکہ کی نیشنل اکیڈمی آف سائنس نے تصدیق کی کہ اس متعدی وبا کی سب سے بڑی وجہ غلہ کی فصل کی یکسانیت تھی۔ اناج کی جو قسم استعمال میں تھی وہ پھپھوندی تھی۔ اکیڈمی نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا، جب ایک جینیاتی جزو نئی بیماری کو قبول کرنے لگا تو پھر امریکہ کی پوری فصل اس بیماری کا شکار ہونے لگی۔

ساتویں دہائی میں اوس میں گندم کو جو وبائی مرض لگا اس کے بارے میں بھی یہی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بات صحیح ہے۔ چار کروڑ ایکڑ زمین پر ایک ہی قسم کا بیج بویا گیا۔ غیر متوقع طور پر اور سائنسی تجربات کے باوجود بعض اوقات بیج شدید سردی برداشت نہیں کرتا۔ جینیاتی یکسانیت کی وجہ سے پوری فصل تباہ ہوگئی۔

بڑے پیمانے پر کاشتکاری نہ صرف بیجوں میں بلکہ تمام جانوروں اور سبزیوں میں جینیاتی تفاوت کو تباہ کر دیتی ہے۔ مصنوعی طریقے سے نئی نسل پیدا نہیں کی جا سکتی۔ نطفہ منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ جین کا انتخاب ممکن نہیں رہتا۔ نئی اقسام کے لیے سرکاری طور پر خصوصی استحقاق کی منظوری اس رجحان کو تیز کرے گی، اس لئے کہ خصوصی استحقاق کے قانون کے تحت نئی اقسام کو اندرونی طور پر یکساں ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ مجاز ادارے کے پاس رجسٹرڈ ہونے کے لیے نئی اقسام کو جینیاتی طور پر موافق ہونا ہوگا اور غیر رجسٹرڈ بیج فروخت کرنا خلاف قانون ہوگا۔

چونکہ کاشتکاروں کو مقابلے کی دنیا میں زندہ رہنا ہے، اس لئے وہ تمام تر وسائل کے ساتھ کاشتکاری کریں گے یا پھر کاروبار سے باہر ہو جائیں گے۔ مزید برآں کاشتکار کیمیکلز فراہم کرنے والوں کے دست نگر بننے پر مجبور ہوں گے۔ چونکہ خصوصی استحقاق والے بیج اور ان کے پودے خاص قسم کے کیمیکلز کا مقابلہ کرنے کے لیے جینیاتی طور پر تیار کئے گئے ہوں، اس لئے ان کیمیکلز کے سپلائر ان کاشتکاروں پر کنٹرول کریں گے جو ان بیجوں کو استعمال کرتے ہیں۔

''بائیوٹیکنالوجی کے بارے میں مزید تفصیلات میں جانے سے پہلے
وہ کون سے سوالات ہیں جو پوچھے جانے چاہئیں اور جن کا جواب دیا
جانا چاہئے؟''

کیا ہم بالکل نئے اور کس قدر نئے دریافت کئے گئے پراڈکٹس کے طویل المیعاد اثرات کو بلاواسطہ یا بالواسطہ سمجھ سکتے ہیں کیا ہم خوفناک نتائج کے بغیر ان کے فائدے حاصل کر سکتے ہیں؟ کیا ہم واقعی یقین رکھتے ہیں کہ نئے قواعد وضوابط زندگی کی ان نئی شکلوں کی حدود میں بے قابو مداخلتوں کو روکنے کے لئے کافی ہوں گے؟ ہم حیات کی نئی شکلوں یعنی جینیاتی طور پر تیار کئے گئے مائیکروبس کو کیسے روک سکتے ہیں جو غیر محدود نقصان پہنچا رہے ہیں ان کے نئے پن کا مطلب ہے کہ زمین پر موجود زندگی، حیوانی اور نباتاتی دونوں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہی کبھی ان پر آشکار نہیں ہوئی اس لئے یہ وبائی امراض کا ثبوت نہیں ہیں۔ کیا ہم سمجھتے ہیں کہ زندگی کی نادریافت نئی شکلوں کی فوری تخلیق کر کے ہم نے اپنے اس جوہر کو کھو دیا ہے جو ہمیں غلطیوں سے سیکھنے کے قابل بناتا ہے۔

دنیا بھر میں ہزاروں محققین تجربے کر رہے ہیں اور حیات کی ایسی نئی شکلوں کی فوری تخلیق کے لئے اپنے خیالات کا استعمال کر رہے ہیں جو فطرت کے لیے اجنبی ہیں یعنی لاکھوں سال کے فطری ارتقاء کے دوران وہ تجربے سے نہیں گزریں۔ ایسی صورت میں کیا یہ ممکن ہے کہ ان غلطیوں سے اور ان حادثات سے بچا جا سکے جس کے نتائج ناقابل تصور ہو سکتے ہیں؟ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ نئے کیمیکلز کو جانچنے اور پرکھنے کے کوئی قابل اعتبار مختصر راستے نہیں ہیں۔ ان کے اثرات کو آشکار ہونے کے لیے سالہا سال چاہئیں۔

لیکن اس سلسلے میں کئی دقیق سوالات سامنے آتے ہیں۔ کیا انسان کو اخلاقی حق ہے کہ وہ نئے مائیکروبس، نئے حیوان اور حیات کی نئی شکلیں تخلیق کرے؟ کیا ہم اتنے عقلمند ہیں کہ ارتقاء کے عمل کو مصنوعی طریقے سے تبدیل کریں اور وہ بھی فوری طور پر؟ کیا ہم جانتے ہیں کہ زیادہ تبدیلی غیر متبدل ہوتی ہے؟ کیا ہم جانوروں کو، کھیتوں کو، جنگلوں اور تمام حیاتیات کو غیر فطری اعلیٰ کارکردگی والی مشینوں میں تبدیل کر سکتے ہیں جن کا واحد مقصد انسانوں کی خدمت کرنا ہے؟ کیا زندہ اشیاء میں تبدیل ہوتی ہوئی جینین سے متعلق بنیادی معلومات، جو موروثی ہی رہے گی، آلودگی کی آخری شکل ہیں؟ کیا انسان کا غصہ اس قدر بھڑکا ہوا ہے؟

''آپ کیا حل تجویز کرتے ہیں؟''

ہمیں اپنی ترجیحات پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ زراعت کا مقصد صرف یہ نہیں کہ کم سے کم لاگت پر، کم سے کم افرادی قوت کے استعمال سے زیادہ سے زیادہ خوراک حاصل کی جائے۔ صحیح مقصد مختلف قسم کے اعلیٰ معیار کی خوراک پیدا کرنا ہونا چاہئے جس سے انسانی صحت برقرار رہے۔ ایک طرح سے ایسی خوراک جو ماحول کو صحیح رکھ سکے۔ جس کا مقصد یہ ہو کہ اس سے روزگار کے اتنے مواقع ضرور میسر آسکیں جو دیہی آبادیوں میں سماجی استحکام برقرار کر سکیں۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ بنیادی طریقوں میں ایسی تبدیلی کی جائے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جن سے ترقی یافتہ قومیں اپنے کاشتکاروں اور اپنی زراعت کو سبسڈائز کرتی ہیں؟''

ہاں۔ سرکاری امداد، جس میں وہ روایتی امداد بھی شامل ہے جو یورپ کی کامن ایگریکلچرل پالیسی کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، اس بنیاد پر دی جائے کہ ریاست کاشتکار کی پیداوار کو ایک متعینہ قیمت پر خریدے گی۔ اگر نظام کی مقدار کی بنیاد پر استوار کیا گیا تو اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ کاشتکار زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی خواہش کریں گے اور پیداوار کے تمام تر طریقوں کو بروئے کار لائیں گے۔

''کیا آپ نامیاتی کاشتکاری تجویز کر رہے ہیں اور اگر ایسا ہے تو کیا یہ کم خرچ ہوگی؟''

میں نامیاتی کاشتکاری کی طرف جانے کی تجویز نہیں دے رہا۔ میں تو اس کاشتکاری کی طرف واپس تجویز کر رہا ہوں جس میں کیڑے مار ادویات، کیمیائی کھادوں، ہارمونز اور اینٹی بائیوٹک اور بائیوٹیکنالوجی کے ذریعے تیار کردہ مصنوعات کے استعمال میں کافی کمی کی جاتی ہے۔ بہت سے ایسے کھیتوں کا تجزیہ کیا جا چکا ہے جن میں میرے تجویز کردہ طریقہ کاشت کو استعمال کیا گیا۔ نیویارک سٹیٹ کالج آف ایگریکلچر اور لائف سائنسز ایٹ کارنیل یونیورسٹی کے ڈیوڈ پمینٹل نے ثابت کیا ہے کہ کم وسائل والے طریقوں کے استعمال سے بہتر خوراک پیدا کی جاسکتی ہے جس پر خرچ بھی کم اٹھتا ہے۔ اصل مصیبت یہ ہے کہ ناقص اور تباہ کن زراعتی طریقوں کے استعمال سے کم مدت میں جلد منافع تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن صحیح اور صحت مند خوراک حاصل نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ بالواسطہ لاگت کو پیش نہ رکھنے سے ہی فوری منافع حاصل ہوتا ہے۔ میں نے ہرمن ڈیلی اور جوہن کوب کی تحقیقاتی رپورٹوں میں سے پہلے ہی حوالے دیئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب پیداوار کو فی ایکڑ پیداوار کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے، یا خرچ ہونے والی افرادی قوت یا استعمال ہونے والے سرمایہ کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے تو چھوٹے فارموں کی پیداوار کہیں زیادہ سامنے آتی ہے۔ لیکن جب پیداوار کو کام کرنے والے افراد کی تعداد کے حوالے سے ناپا جاتا ہے تو پھر بڑے مشینی اور جدید مونو کلچرز بہترین ثابت ہوتے ہیں۔

''اگر ہم تمام تر وسائل کے ذریعے کاشتکاری سے کم نسبتاً کم وسائل کے ذریعے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کاشتکاری کے طریقوں کی طرف جائیں تو اس سے کون نقصان میں رہے گا اور کس کی جیت ہو گی؟''

آیئے جیتنے والوں سے شروع کرتے ہیں۔ دیہی آبادیوں میں دوبارہ استحکام آ جائے گا۔ شہروں اور ان میں رہنے والے لوگوں کو اس سے فائدہ ہو گا اس لئے کہ دیہی علاقوں سے آبادی کی منتقلی ختم ہو جائے گی۔ صارفین کو صحت مند خوراک مل سکے گی۔ کیمیائی اور بائیوٹیکنالوجی سے تیار ہونے والی اشیاء کے ذریعے پیدا ہونے والی آلودگی بڑی حد تک کم ہو جائے گی۔ دنیا بھر کی ریاستوں پر فلاح و بہبود پر اٹھنے والے اخراجات کا بوجھ ختم ہو جائے گا جو بے زمین کئے جانے والوں پر اٹھتے ہیں اور انہیں روزگار بھی مہیا نہیں ہوتا اور نہ ہی حکومتوں کو شہروں کے اندر زندگی کی سہولتیں فراہم کرنے پر مزید اخراجات برداشت کرنے پڑیں گے جو دیہی علاقوں سے آنے والوں پر خرچ ہوتے ہیں۔ نقصان اٹھانے والوں کی شناخت بہت آسان ہے۔ نقصان ہو گا کیمیکل اور بائیوٹیکنالوجی انڈسٹریز کو اور ان کے ماہرین اور لابی کرنے والوں کو جو اس کی بھاری قیمت وصول کرتے ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب 6

ایٹمی توانائی...... بہت بڑا جھوٹ

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ توانائی سے متعلق ہماری پالیسی میں ایک بڑی تبدیلی ممکن ہو سکتی ہے؟''

ہاں۔ ایسی ٹیکنالوجی اب میسر ہے جس کے ذریعے توانائی پیدا کرنے اور اس کے استعمال کے طریقے کو ہم بدل سکتے ہیں۔ اگر ہم بنیادی تبدیلی کریں تو معیشت، ماحول اور عوامی تحفظ کے لیے اس کے اثرات غیر معمولی طور پر مفید ہوں گے۔

''وہ کون سی تبدیلی ہے جس نے آپ کو اس قدر پرامید بنا دیا ہے؟''

سرد جنگ ختم ہو چکی ہے۔ سرد جنگ کے دوران بنیادی ہتھیار ایٹمی تھے۔ توانائی فوجی ریسرچ کی توسیع تھی اور دونوں کو کنٹرول وہی سرکاری ماہرین سائنس کرتے تھے جو قومی تحفظ کی بنا پر اس وقت بھی جب ایٹمی پروگرام غیر فوجی منصوبوں تک وسیع کر دیا گیا، اسے راز کے طور پر ہی خفیہ رکھتے تھے۔ بعد میں آنے والی حکومتوں کا بھی یہی خیال تھا کہ اگر سول پراجیکٹ میں مسائل پیدا ہوئے تو انہیں خفیہ ہی رکھا جائے تاکہ فوجی پروگرام کو کوئی خطرہ درپیش نہ ہو۔

پہلے تو یہ سوچا گیا کہ ایٹمی توانائی محفوظ اور غیر محدود ہوگی اس لئے درآمدی توانائی پر مغرب کا انحصار ختم ہو جائے گا۔ یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ ایٹمی ذرائع سے پیدا کی جانے والی بجلی بہت سستی ہے اور یو ایس ایٹامک انرجی کمیشن کے چیئرمین نے اس کا دعویٰ بھی کیا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مغربی حکومتوں نے اپنے وسائل کا بڑا حصہ ایٹمی توانائی کی ترقی کے لیے مختص کر دیا۔ 1979ء اور 1990ء کے درمیان انٹرنیشنل انرجی ایجنسی کے رکن ممالک نے اپنے انرجی ریسرچ بجٹ کا ساٹھ فیصد ایٹمی بجلی پر خرچ کیا۔ صرف 9.4 فیصد توانائی کے قابل تجدید ذرائع کی ترقی پر اور 6.4 فیصد توانائی کو محفوظ کرنے کے طریقوں پر خرچ کیا۔

ریاست کی طرف سے لامحدود حمایت کے ساتھ ایٹمی سائنسدانوں اور ایڈمنسٹریٹروں نے خفیہ طور پر اور قانون کو نظر انداز کرتے ہوئے کام کیا۔ ایٹمی توانائی کے ان ماہرین نے ریاست کے اندر ایک قسم کی ریاست قائم کر لی۔ اس وقت جب یہ واضح ہو گیا کہ ایٹمی توانائی اقتصادی لحاظ سے بوجھ کے علاوہ سخت خطرناک بھی ہے تو بھی عوام سے حقائق کو چھپایا گیا۔

''ہمیں کون سے متبادل ذرائع پر غور کرنا چاہیے؟''

ضرورت اس بات کی تھی کہ ایسی ٹیکنالوجیز دریافت کی جائیں جن کے ذریعے توانائی کے استعمال کو تبدیل کر دیا جائے اور یہ ٹیکنالوجیز موجود ہیں اور تجارتی طور پر مہیا ہو سکتی ہیں۔ امریکہ اس شعبہ میں بہت سے آگے ہے۔

امریکہ میں توانائی تین بڑے شعبوں میں استعمال ہوتی ہے، رہائشی اور تجارتی سطح پر اور اس میں کل توانائی کا 36 فیصد حصہ خرچ ہوتا ہے۔ صنعتوں میں 37 فیصد، ٹرانسپورٹ میں 27 فیصد خرچ ہوتا ہے۔ اگر ہم بہتر خدمات مہیا کریں تو ان شعبوں میں توانائی کے استعمال کو بڑی حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے فوائد ان گنت ہوں گے۔ پہلا فائدہ تو یہ ہو گا کہ توانائی کے کم استعمال سے اقتصادی ترقی دوگنا بڑھے گی۔ فی الحال روائتی سوچ تو یہ ہے کہ اقتصادیات کی ترقی کے ساتھ توانائی کا استعمال بھی بڑھتا ہے۔ لیکن یہ سوچ اب صحیح نہیں رہی۔ حقیقت میں ہم مالی بچتوں کی مطابقت سے توانائی کی فی یونٹ استعمال میں ڈرامائی طور پر کمی کر سکتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ماحولیات، پر اثرات ابھی کم ہوں گے۔ تیسرا یہ کہ درآمدی توانائی پر انحصار آہستہ آہستہ کم یا مکمل طور پر ختم کیا جا سکتا ہے اور آخری فائدہ یہ ہے کہ ان نئی ٹیکنالوجیز کی بنیاد پر قائم کی گئی نئی صنعتیں صحت مند اقتصادی ترقی کا وسیلہ ثابت ہوں گی۔

''بجلی کے استعمال کو بہتر بنانے کے کیا مواقع ہیں؟''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شمالی امریکہ کے الیکٹرک پاور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا اندازہ ہے کہ فنی ٹیکنالوجی کے مکمل استعمال کے ذریعے امریکہ میں بجلی کے خرچ میں 55 فیصد تک کمی لائی جا سکتی ہے۔ یو ایس ڈیپارٹمنٹ آف انرجی اینڈ انوائرنمنٹل پروٹیکشن ایجنسی کا خیال ہے کہ فنی اصلاح کے ذریعے روشنی کرنے کے لیے استعمال ہونے والی 80 فیصد بجلی بچائی جا سکتی ہے۔ راکی ماؤنٹین انسٹی ٹیوٹ کا اندازہ ہے کہ امریکہ کے گھروں، دفتروں اور فیکٹریوں میں اس وقت جتنی بجلی استعمال کی جاتی ہے اس کا 75 فیصد موجودہ ٹیکنالوجی کے استعمال سے بچایا جا سکتا ہے۔ اس ٹیکنالوجی کا استعمال خرچ کم اور بالانشین کے مصداق ہے اور اس کے ذریعے سروس بھی بہتر مہیا کی جا سکے گی۔

امریکہ کی سب سے بڑی کمپنی پیسفک گیس اینڈ الیکٹرک کمپنی کو توقع ہے کہ موجودہ دہائی کے دوران بجلی کی 75 فیصد نئی ضرورتوں کی کارکردگی بڑھا کر اور صارف کی ضرورت کو کم کر کے پورا کیا جا سکتا ہے۔ باقی بجلی قابل تجدید ذرائع سے حاصل کی جائے۔ اس کمپنی کا کہنا ہے کہ نئے جینر ٹینگ سٹیشن قائم کرنے کی ضرورت نہیں اور اس نے اپنے سول انجینئرنگ اور کنسٹرکشن ڈویژن ختم کر دیئے ہیں۔ جبکہ 1981ء میں یہ کمپنی دس نئے جینر یٹنگ سٹیشن قائم کرنے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔

''ہم یہ بچتیں کیسے کر سکتے ہیں؟''

راکی ماؤنٹین انسٹی ٹیوٹ نے بجلی بچت سے متعلق جامع دستاویز شائع کی ہے جس میں مختلف طرح کی مثالیں دی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ میں وائر اور کیبل تیار کرنے والی سب سے بڑی کمپنی ساؤتھ وائر نے اپنے ہاں بجلی اور گیس کے استعمال میں بالترتیب 40 اور 60 فیصد کمی کی ہے۔ کو پیک کمپیوٹر کارپوریشن نے اپنے ہوسٹن کے دفاتر میں بجلی کے استعمال میں پچاس فیصد کمی کی ہے۔ ایک پراپرٹی ڈیویلپمنٹ کمپنی ڈگلس ایمیٹ نے کیلیفورنیا کی ایک دفتری عمارت میں بجلی کے استعمال میں 75 فیصد کمی کی ہے۔ پیسفک گیس اینڈ الیکٹرک کمپنی نے کیلیفورنیا کے شہر سان ایمن میں اپنی پرانی دفتری عمارت میں اور شہر اینٹوک کی دفتری عمارت میں بھی بجلی کے استعمال میں اسی قدر کمی کی ہے۔ مزید برآں اس ادارے نے کیلیفورنیا کے شہر ڈیوس میں ایک تجرباتی گھر حال ہی میں تعمیر کیا ہے جس میں گرمیوں میں درجہ حرارت 45 ڈگری سنٹی گریڈ تک جا سکتا ہے۔ یہ معمولی سا نظر آنے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

والے اس درمیانی قیمت کے مکان میں نہ تو مکان کو گرم کرنے اور نہ ٹھنڈا کرنے کے آلات نصب کرنے کی ضرورت ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ اس گھر میں امریکہ میں عمارتوں میں استعمال کی جانے والی بجلی کا جو معیار مقرر ہے اس کا پانچواں حصہ بجلی خرچ ہو گی۔ اگر اسی طرح کے گھر تعمیر کئے جانے لگے تو اس قسم کے معمول کے مکان کی تعمیر کی لاگت میں اٹھارہ سو ڈالر کی کمی آ جائے گی۔

اس میں مختلف قسم کی ٹیکنالوجی استعمال کی گئی ہے۔ اس میں انسولیشن کے نئے طریقے، کھڑکیاں جن سے روشنی اندر آتی ہے لیکن جو حرارت کو روکتی ہے، روشنی کا ایسا نظام جس سے ہر شے نظر آئے لیکن بجلی کے استعمال میں 80 سے 90 فیصد کمی آئے، ایئر کنڈیشننگ کا نیا نظام جس سے بجلی کے فی یونٹ کے استعمال میں 90 فیصد سے زائد کمی آئے، شامل ہیں۔ اگر امریکی حکومت اس نئے نظام کو اپنانے پر رضا مند ہو جائے تو اس پر تقریباً 200 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری درکار ہو گی جبکہ سالانہ بچت 100 سے 130 بلین ڈالر ہو گا۔

''کیا یورپ میں بھی ایسے مواقع موجود ہیں؟''

امریکہ نے روایتی طور پر اپنی مجموعی قومی پیداوار کے تناسب کے لحاظ سے یورپ کی نسبت کہیں زیادہ توانائی استعمال کی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں بجلی سستی ہے۔ لیکن یورپ میں بھی بڑی بچتیں کرنے کے مواقع موجود ہیں۔ تفصیلی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ سویڈن میں بجلی کے استعمال میں 50 فیصد اور ڈنمارک میں 75 فیصد کمی کی جا سکتی ہے۔ جرمنی میں عام گھروں میں 80 فیصد تک بجلی کی بچت ممکن ہے۔

''ٹرانسپورٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

امریکہ میں جو پٹرول استعمال ہوتا ہے اس کا ایک تہائی ٹرانسپورٹ میں خرچ ہوتا ہے۔ ایسی ٹیکنالوجی موجود ہے جس کے ذریعے ہلکی گاڑیوں کی کارکردگی کو بہتر بنا کر پٹرول کے استعمال میں 50 فیصد کی جا سکتی ہے۔ امریکہ کی گاڑیاں تیار کرنے والی تین بڑی کمپنیوں نے امریکی حکومت کے ساتھ مزید بہتر کارکردگی والی گاڑیاں بنانے پر اتفاق کیا ہے۔

راکی ماؤنٹین انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر اے بی لوونز کا خیال ہے کہ آئندہ کچھ عرصے میں ٹیکنالوجی میں جو انقلاب آنے والا ہے اس کے نتیجے میں بے حد ہلکی الیکٹرک سپر کار تیار

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہو گی۔ ایک حالیہ تحقیق میں لوونز نے بتایا ہے کہ کس طرح پانچ سواریوں والی ہلکی ترین گاڑی 1.6 لیٹر پٹرول کے ساتھ ایک سو کلو میٹر کا سفر کرے گی۔ انکا دعویٰ ہے کہ یہ گاڑی موجودہ گاڑیوں سے زیادہ پائیدار، بے آواز اور زیادہ آرام دہ ہو گی اور اس کے علاوہ موجودہ گاڑیوں کی نسبت مہنگی نہیں ہو گی۔ لوونز کے مطابق ایروڈائنامکس، پولی رکمپوزٹ الٹرالائٹ میٹریلز، مائیکرو الیکٹرانکس، پاور الیکٹرانکس، ایڈوانسڈ موٹر اینڈ انرجی سٹوریج ٹیکنالوجیز، کمپیوٹر ایڈڈ ڈیزائن اینڈ مینوفیکچرنگ اور ایڈوانسڈ سافٹ ویئر کے شعبوں میں جو ترقی ہوئی ہے، اس سے ایندھن کے استعمال میں ڈرامائی کمی آ سکتی ہے۔ اسی طرح بھاری گاڑیوں میں بہتری پیدا کرنے کے امکانات بھی موجود ہیں۔ ان دونوں سے امریکہ میں گاڑیوں میں پٹرول کے استعمال میں بہت بھاری کمی کی جا سکتی ہے۔ پوری دنیا میں اس قدر تیل بچایا جا سکتا ہے جتنا اوپیک کے رکن ممالک اب پیدا کرتے ہیں۔ اسے ماحولیات کو پہنچنے والے اس نقصان میں بھی کمی آئے گی جو پٹرول اور ڈیزل کے جلنے سے ہوا ہے۔

''کیا ہم نئی ٹیکنالوجی کو استعمال میں آتے ہوئے دیکھ سکیں گے؟''

امریکہ میں تبدیلیاں بڑی تیزی کے ساتھ رونما ہو رہی ہیں۔ ان ملکوں کو چھوڑ کر جہاں ایٹمی ماہرین بہت زیادہ طاقتور ہیں، یورپ کے باقی ملک اس عظیم انقلاب میں شریک ہو سکتے ہیں۔ وہ ملک جہاں ایٹمی ماہرین کا قبضہ ہے، اپنی صنعت کو بچانے کی جنگ لڑ رہے ہیں اور یہ کام وہ اس کی لاگت اور اس کے تحفظ کے بارے میں غلط معلومات پھیلا رہے ہیں۔ ریاستی حمایت کے ساتھ یہ ماہرین اپنے پراپیگنڈے میں غیر حقیقی دعوے کرتے ہیں اور وہ رونما ہونے والے ہر خطرناک حادثے کو چھپانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہم نے اس طاقتور بیوروکریسی کو غالب آنے دیا تو پھر ہماری معیشتیں بوڑھی ہوتی ہوئی نیوکلیئر انڈسٹری کی وجہ سے مفلوج ہو جائیں گی اور فرانس جیسے ممالک دقیانوسی ٹیکنالوجی کے عجائب گھر بن کر رہ جائیں گے۔

''توانائی کے ایسے کون سے نئے ذرائع ہیں جو امریکہ میں زیر استعمال آ رہے ہیں؟''

توانائی کے وہ تمام بڑے ذرائع جو اس وقت موجود ہیں زیر استعمال ہیں، یعنی تیل، کوئلہ اور گیس۔ ان تمام ذرائع کی وجہ سے ماحولیات کو نقصان ہو رہا ہے اور نیوکلیائی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

توانائی تو خاص طور پر بے حد خطرناک ہے۔ حرارت اور قوت کی مشترکہ ٹیکنالوجیز جو روایتی معدنی ایندھن کے ساتھ ملاپ میں استعمال ہوتی ہیں، خاص طور پر ٹربائنیں لگائی گئی ہیں۔ پن بجلی کے استعمال کی اجازت ملنے کے بعد اس میں بہتر تکنیکی تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں۔ مثلاً جدید ترین بلیڈز، بہتر ٹرانسمیشن اور جنریٹرز اور بڑی ٹربائنیں۔ ان سب کی وجہ سے فی کلو واٹ آور قیمت چھ سینٹ کم ہوئی ہے۔ ڈاکٹر مائیکل اور نائلز میٹر نے پن بجلی اور اپنی تحقیق میں لکھا ہے کہ کس طرح پن بجلی امریکہ میں توانائی کا اہم ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس وقت سان فرانسسکو میں اس بجلی کا استعمال ہو رہا ہے اور پوری دنیا میں اس سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔

شمسی توانائی تمام ذرائع سے زیادہ اہم ہے۔ بڑے پیمانے پر سولر تھرمل کے چھوٹے بجلی گھروں کی وجہ سے بجلی کی لاگت میں بڑی حد تک کمی آئی ہے۔ یہ بجلی گھر سیال (پانی) کو گرم کرنے کے لئے سورج کی شعاعیں وصول کر کے انہیں ایک جگہ مرتکز کرتے ہیں جس سے ٹربائن کے لئے بھاپ پیدا ہوتی ہے اور یہ ٹربائن بجلی پیدا کرتے ہیں۔ شمسی توانائی کی فی کلو واٹ گھنٹہ قیمت 1984ء میں 26 سینٹ تھی جو اب آٹھ یا نو سینٹ رہ گئی ہے۔ امریکہ کی ہزاروں عمارتوں میں اس وقت شمسی توانائی ہی استعمال ہو رہی ہے۔ اندازہ ہے کہ 2030ء تک پورے امریکہ میں شمسی توانائی ہی رواج پا جائے گی۔

''ایٹمی توانائی کے بارے میں خیال تھا کہ مستقبل میں توانائی کا ذریعہ وہی ہو گی۔ اس کے خلاف کیا دلائل ہیں؟''

آیئے برطانیہ کے تجربے سے شروع کرتے ہیں۔ 1988ء میں تھیچر حکومت نے الیکٹرسٹی انجینئرنگ انڈسٹری جس میں ایٹمی توانائی بھی شامل تھی، کو نجی شعبہ میں دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر اسے عوام میں فروخت کرنا ہے تو پھر متعلقہ ادارے کو منافع بخش مستقبل کا وعدہ کرنا ہو گا۔ تھیچر حکومت کو یقین تھا کہ ایٹمی توانائی کا معاملہ بھی ایسا ہی رہے۔ برطانیہ کے نیوکلیئر کے ماہرین نے یہ یقین دہانیاں کرائی تھیں اور اپنی ان یقین دہانیوں کو سچ ثابت کرنے کے لیے بے شمار اعداد و شمار پیش کیے تھے لیکن یہ قانونی ضرورت ہے کہ پرائیوٹائزیشن سے پہلے پراسپکٹس شائع کیا جائے جو انڈسٹری کے بارے میں تفصیل ظاہر کرے، اس کے نتائج اور اس کی استعداد کے بارے میں بتائے۔ پراسپکٹس آزاد انوسٹمنٹ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بنکرز اپنے اکاؤنٹنٹس کے ذریعے تیار کرتے ہیں۔ جب ایسا کیا گیا تو اصل حقائق سامنے آنا شروع ہو گئے۔

مثال کے طور پر 5 جولائی 1988ء کو یہ انکشاف کیا گیا کہ انڈسٹری اپنے اکاؤنٹنگ کے قواعد وضوابط تبدیل کرنے کی تجویز دے رہی ہے۔ بڑی آسانی کے ساتھ اس نے ایٹمی بجلی گھر ناکارہ ہو جانے کی مدت کو 135 سال تک پھیلا دیا اور کہا کہ ہم دوبارہ پن چکیوں کی طرف رجوع کریں گے۔ حساب کتاب کی اس جادوگری نے ایٹمی بجلی گھروں کی کارکردگی کو ایک طویل عرصے پر پھیلا دیا اور اس طرح حساب کتاب کا چکر چلایا۔

27 جولائی 1988ء کو دارالعلوم کی انرجی سلیکٹ کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں کہا گیا تھا ''ہمیں ایٹمی توانائی پر آنے والی لاگت پر تشویش ہے۔ حکومت نے کوئلے کی صنعت کے ساتھ جو غیر مساویانہ سلوک کیا اس پر ہمیں پریشانی ہے۔ ایٹمی صنعت کے مسائل کو بہت زیادہ اجاگر کیا گیا ہے جبکہ کوئلے کی صنعت کی طرف جذباتی مخالفت کا رویہ اپنایا گیا ہے، یہ ایک اہم رائے ہے۔ برطانوی ایٹمی توانائی کی ترقی کے پیچھے نیشنل یونین آف مائن ورکرز کو تباہ کرنے کی سیاسی خواہش کام کر رہی ہے۔ اس لیے کہ اس یونین کی قیادت مارکسسٹوں کے ہاتھ میں ہے اور ایڈورڈ ہیتھ کی کنزرویٹو گورنمنٹ کا خاتمہ اسی یونین کی وجہ سے ہوا تھا۔

دسمبر 1988ء میں حکومت نے اپنا الیکٹرسٹی بل شائع کیا۔ بل میں یہ تجویز شامل تھی کہ حکومت نیوکلیائی صنعت کو امداد فراہم کرے تاکہ یہ منافع بخش نظر آئے۔ جولائی 1989ء میں اس وقت کے توانائی کے وزیر نے دارالعلوم میں اعلان کیا کہ ''نج کاری کے لیے ہماری تیاریوں کے نتیجے میں یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ صرف شدہ ایٹمی ایندھن میگناکس کے ری پراسیسنگ اور تلف شدہ ایندھن کو دوبارہ استعمال کے قابل بنانے پر اٹھنے والی لاگت اس قیمت سے کہیں زیادہ ہو گی جو بجلی کے نرخ کے طور پر وصول کی جا رہی ہے اور جو سنٹرل الیکٹرسٹی جنریٹنگ بورڈ اور ساؤتھ آف سکاٹ لینڈ الیکٹرسٹی بورڈ کو ان کی ضرورتوں کے حوالے سے مہیا کی جا رہی ہے۔ فیصلہ کیا گیا ہے کہ میگناکس سٹیشنوں سے متعلق اثاثے اور ذمہ داریاں حکومت کے کنٹرول میں رہیں۔ ترقی یافتہ گیس کولڈری ایکٹر سٹیشن بہرحال پرائیوٹائز کیے جائیں گے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

31 اکتوبر 1989ء کو اخبار فنانشل ٹائمز نے ''پاور ان یورپ'' پر ایک خصوصی ضمیمہ شائع کیا اور کابینہ کی ایک ایسی دستاویز شائع کی جو پہلے ہی افشا ہو چکی تھی۔ اس دستاویز نے تصدیق کی کہ ایٹمی توانائی کی قیمت روایتی طریقوں سے پیدا کی گئی توانائی کی قیمت سے دوگناہ ہے۔

9 نومبر 1989ء کی وزیر توانائی نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ گیس کولڈ ری ایکٹرز سمیت نیوکلیائی صنعت کو پرائیوٹائز کرنے کا تمام منصوبہ واپس لے لیا جائے گا۔ انہوں نے نیوکلیائی بجلی گھروں کی تعمیر پر پانچ سال کے لئے پابندی عائد کر دی۔ اسی دوران دارالعلوم میں سکاٹ لینڈ کے وزیر نے وضاحت کی کہ نہ تو حکومت کے اپنے ماہرین اور نہ ہی مالیاتی مشیر موجود بجلی گھروں کو ختم کرنے پر اٹھنے والی لاگت مقرر کر سکتے ہیں۔

توانائی کے سابق وزیر اور خزانہ کے اس وقت کے چانسلر نائیجل لاسن نے نج کاری کے عمل کو اس طرح بیان کیا:

ایک اور اہم شعبہ جس میں قابل قبول دانش وحکمت غلط ثابت ہوئی وہ ایٹمی توانائی ہے۔ پتہ چلا کہ برسوں تک سنٹرل الیکٹرسٹی جیز یٹنگ بورڈ شعوری یا غیر شعوری طور پر ایٹمی توانائی کی اقتصادیات کے حق میں جھوٹا مقدمہ تیار کرتی رہی ہے۔ یہ بورڈ ایٹمی بجلی گھروں کو میعاد کے خاتمہ پر ختم کرنے پر اٹھنے والی متوقع صحیح لاگت کو بہت کم ظاہر کر کے پیش کرتا رہا ہے۔ وہ اس میں کامیاب اس لیے رہے کہ ابھی تک کوئی بھی ایٹمی بجلی گھر ختم نہیں کیا گیا۔ اگر نج کاری نہ ہوتی تو کونجانے کہ کب تک ملک ایٹمی توانائی کی غلط اقتصادیات کی قیمت ادا کرتا رہتا۔''

''برطانیہ کے نیوکلیو کریٹس (نیوکلیائی شعبہ کے نام نہاد ماہرین) نے
اس پر کیا ردعمل ظاہر کیا؟''

چند برسوں تک انہوں نے خود کو نمود و نمائش سے دور رکھا۔ لیکن اب وہ دوبارہ پر اعتماد ہو رہے ہیں۔ نیوکلیئر الیکٹرک نے حال ہی میں ایک ریسرچ کمپنی مقرر کی ہے جو اسے نئے نام کے انتخاب کے بارے میں مشورہ دے گی۔ جو پندرہ نام زیر غور آئیں گے ان میں سیف کو، اینوائر وجین، جین کو اور بریتانیہ الیکٹرک شامل ہیں لیکن ایٹمی توانائی کی کوئی تجویز شامل نہیں ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکن جو حقائق مسلسل سامنے آ رہے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیوکلیو کریسی نے غلط اعداد و شمار پیش کرنے اور سچ کو چھپانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ 1988ء میں سنٹرل الیکٹرسٹی جینیٹنگ بورڈ نے خرچ شدہ ایندھن اور ایٹمی بجلی گھر کو ختم کرنے پر اٹھنے والے اخراجات کا تخمینہ 2.63 بلین پنڈ لگایا تھا۔ 1989ء میں یہ رقم بڑھ کر 7.63 بلین پنڈ ہو گئی۔ 1987ء میں برٹش نیوکلیئر فیولز نے اپنے آلودہ پلانٹوں کو ختم کرنے پر اٹھنے والی لاگت کا تخمینہ 4.38 ملین پنڈ لگایا تھا۔ 1988ء میں یہ رقم بڑھ کر 4.6 بلین پنڈ ہو گئی۔

1989ء میں جب ایٹمی توانائی کو پرائیوٹائز کرنے کی برطانوی کوشش ختم کر دی گئی تو اسے ختم کرنے کی لاگت کا تخمینہ 15 بلین پنڈ تک پہنچ گیا۔ تازہ ترین تخمینہ کے مطابق برطانیہ کے موجودہ ایٹمی بجلی گھروں کو ختم کرنے پر اٹھنے والی لاگت 22 تا 23 بلین پنڈ تک پہنچ چکی ہے۔ ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان نیوکلیوکریٹس کو تاہ بینی اور کج روی کی وجہ سے مستقبل کی نسلوں کو کس قدر اقتصادی بوجھ اٹھانے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

’’کیا اس قسم کے واقعات کہیں اور بھی سامنے آئے ہیں؟‘‘

امریکہ میں ایٹمی انڈسٹری کو عدالتوں کی وجہ سے مجبور ہو کر تحفظ، معتبری، اقتصادیات اور دوسرے نامعقول مسائل سے متعلق کافی رازوں کو ظاہر کرنا پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1973ء میں جن ایٹمی بجلی گھروں کی تنصیب کا حکم دیا گیا تھا وہ منسوخ کرنا پڑا اور 1978ء سے اب تک کوئی نئے آرڈر نہیں دیئے گئے۔ آرڈرز کی منسوخی کی بڑی وجوہ تحفظ، تعمیر اور پلانٹ کو چالو رکھنے پر اٹھنے والی لاگت میں مسلسل اضافہ (جو تین سے پانچ گنا تک بڑھ چکا ہے) اور تینتالیس ریاستوں کی طرف سے منظور ہونے والے قواعد ہیں۔ ان قواعد کی وجہ سے کم سے کم قیمت پر بجلی مہیا کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ جب حقائق سامنے آئے تو ایٹمی بجلی گھر بیکار ہو کر رہ گئے، اس لیے کہ وہ ان قواعد کے مطابق کم قیمت پر بجلی مہیا نہیں کر سکتے تھے۔ ایک تجزیے کے مطابق اس دہائی کے خاتمہ تک وہ تمام ایٹمی بجلی گھر مکمل طور پر بند ہو جائیں گے جو اس وقت کام کر رہے ہیں، اس لیے کہ انہیں چلانا اقتصادی طور پر ممکن ہی نہیں ہوگا۔

ایٹمی توانائی کا کوئی مستقبل نہیں ماسوا وہاں جہاں توانائی کی پیداوار کو مرکزی سطح پر کنٹرول کیا جاتا ہے اور جہاں کم قیمت والے دوسرے ذرائع کو ابھرنے ہی نہ دیا جائے اور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جہاں جمہوری طور پر فیصلے نہیں کیے جاتے۔ جہاں کہیں ایٹمی توانائی کو فری مارکیٹ میں ٹیسٹ کیا گیا، وہاں اس کی حمایت میں کوئی بھی آواز نہ اٹھ سکی۔ چنانچہ ایٹمی توانائی وہیں کامیاب ہوسکتی ہے جہاں حکومت مالی امداد مہیا کرے اور جہاں آزدانہ بحث ومباحثہ ممکن نہ ہو۔

''عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فرانس ایک ایٹی موثر ایٹمی انڈسٹری تعمیر کرنے میں کامیاب رہا ہے جو کم خرچ ہونے کے ساتھ ساتھ محفوظ بھی ہے۔ کیا ایسا ہی ہے؟''

نہیں۔ یہ کہنا کہ کچھ لوگ اسے سچ سمجھتے ہیں دراصل نیوکلیوکریٹس کی پراپیگنڈہ مہم کے محض موثر ہونے کا ثبوت ہے۔ فرانس کے ایٹمی بجلی گھر فرانس میں پیدا ہونے والی کل بجلی کا 78 فیصد پیدا کرتے ہیں اور اس کی قیمت کو روایتی ذرائع سے پیدا کی جانے والی بجلی کی قیمت کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قیمت اور لاگت میں فرق کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ قیمت وہ عدد ہے جس پر انڈسٹری صارفین کو بجلی فروخت کرتی ہے۔ لاگت وہ اصل رقم ہے جو انڈسٹری بجلی پیدا کرنے پر خرچ کرتی ہے۔ قیمت لاگت کی نسبت بہت بھاری امداد ملنے کی وجہ سے کم ہوسکتی ہے۔ یہ امداد سرکاری بھی ہوسکتی ہے اور الیکٹرسٹی ڈو فرانس کی دوسری مدوں سے بھی حاصل ہوسکتی ہے۔ انگلستان کی طرح لاگت میں وہ رقوم بھی شامل ہونی چاہئیں جو ایٹمی بجلی گھروں کی میعاد ختم ہو جانے کے بعد انہیں بند کر دینے اور ریڈیو ایکٹو فضلہ کو ذخیرہ کرنے پر خرچ ہوتی ہیں۔ عملی طور پر اس کا حساب کتاب لگانا ناممکن ہے۔ اس لیے ہم نہیں جانتے کہ فرسودہ بجلی گھروں کو مکمل طور پر کیسے بند کیا جاتا ہے۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ریڈیو ایکٹو فضلہ کو کیسے ضائع کیا جاتا ہے یا طویل مدت کے لیے کیسے محفوظ کیا جاتا ہے۔ الیکٹرسٹی ڈو فرانس نے خود اسے بچوں و چرا اپنے اس خط میں تسلیم کیا ہے جو اس نے فرانسیسی حکومت کے آرڈٹنگ آفس کو بھیجا۔ اس میں کہا ہے کہ ایٹمی بجلی گھروں کو بند کرنے کے لیے مستقبل میں اٹھنے والی لاگت پرانے تخمینوں کے مطابق ہی بتائی جا رہی ہے اور اس کی وجہ مزید معتبر اعداد وشمار کا نہ ہونا ہے۔

قیمت اور لاگت کے درمیان فرق کے باوجود اور نیوکلیوکریٹس کے دعوؤں کے باوجود فرانس میں بجلی کی قیمتیں کم نہیں ہیں۔ جرمن الیکٹرسٹی جنریٹنگ کمپنیز فیڈریشن نے 1992ء کے دوران پورے یورپ میں وصول کی جانے والی بجلی کی قیمتیں شائع کی ہیں۔ مطالعاتی تجزیے کے مطابق گھروں میں بجلی کا سالانہ استعمال 3500 کلو واٹ گھنٹہ ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نیدر لینڈز، ڈنمارک، آئرلینڈ، لکسمبرگ، جرمنی، یونان اور برطانیہ کی نسبت فرانس میں بجلی کی قیمت زیادہ ہے۔ ان ممالک میں سے ڈنمارک، آئرلینڈ، لکسمبرگ اور یونان میں ایٹمی توانائی استعمال نہیں ہوتی۔ نیدر لینڈ میں پیدا ہونے والی کل بجلی کا صرف 2 فیصد ایٹمی بجلی ہے اور ایٹمی بجلی کے بڑے صارف یعنی جرمنی اور برطانیہ (جہاں بالترتیب کل بجلی کا 34 فیصد اور 27 فیصد ایٹمی بجلی ہے) میں بجلی کی قیمت فرانس کی نسبت آدھی سے بھی کم ہے۔ فرانس میں کل بجلی کا 78 فیصد ایٹمی بجلی ہے۔

1993ء میں فرانس کی وزارت صنعت نے جو اعداد و شمار جاری کیے، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مفروضوں کے باوجود، جو ایٹمی توانائی کے حق میں جاتے ہیں، ایٹمی ذرائع سے پیدا کی جانے والی بجلی کمبائنڈ ہیٹ اینڈ پاور پلانٹس سے حاصل ہونے والی بجلی سے 50 فیصد زیادہ مہنگی ہے۔ ان پلانٹس میں کوئلے کے ذریعے بھاپ کی ٹربائنیں چلائی جاتی ہیں۔ اگر گیس ٹربائنیں استعمال کی جائیں تو ایٹمی بجلی اور زیادہ مہنگی ہو جائے گی۔

اہم بات یہ ہے کہ الیکٹرسٹی ڈو فرانس ان حقائق کو کس طرح پیش کرتا ہے۔ جون 1989ء کی اپنی رپورٹ میں جو 1990ء سے 1992ء تک کے لیے تجارتی حکمت عملی سے متعلق ہے، کمپنی نے حرارت اور قوت سے پیدا کی جانے والی بجلی اور بجلی کی ڈی سینٹرلائزڈ پیداوار کو ''خطرات'' قرار دیا ہے۔ اس نے سرکاری حکام پر دباؤ ڈال کر حرارت اور قوت سے پیدا کی جانے والی بجلی کی مخالفت کی ضرورت کی سفارش کی ہے۔

میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ جب یہ کتاب پہلی بار فرانسیسی میں شائع ہوئی تو اس نے بحث و مباحثہ کو جنم دیا۔ نتیجے کے طور پر مجھے سرکاری حمایت حاصل ہونے والے چالیس صنعت کاروں کے ایک اجلاس میں اس پر بحث کرنے کی دعوت دی گئی۔ اجلاس کے دوران مجھ پر ایک نیوکلیوکریٹ نے تابڑ توڑ حملے کیے جو میرے لیے غیر متوقع نہیں تھے۔ خیالات کے تبادلے کے ایک اہم صنعت کار نے سٹیج سنبھال لیا اور یہ صنعت کار وہ ہے جو فرانس کے ایٹمی پروگرام کے بانیوں میں سے تھا۔ اس نے ہمیں یاد دلایا کہ وہ اس کمیٹی کا رکن تھا جس نے فرانس کی پہلی نیوکلیائی حکمت عملی ترتیب دی اور اعلان کیا کہ وہ اس اجلاس میں اپنے پچھتاوے کا اظہار کرنے آیا ہے۔ اس نے کہا کہ کمیٹی نے جو فیصلہ کیا تھا وہ مالی طور پر اور تحفظ کے اعتبار سے غلط تھا۔ اس کی اس بات سے اجلاس میں سناٹا چھا گیا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''ایٹمی توانائی کی صنعت کے تحفظ کے بارے میں کیا کہیں گے؟''

ایٹمی توانائی کی صنعت کی تاریخ دھوکہ دہی اور جھوٹ کا طویل سلسلہ ہے۔ اس کی بہترین مثال چرنوبل ہے۔ چرنوبل کے حادثہ کے بعد الیگزینڈر لشسکو نے جو آج کل انٹرنیشنل سخاروف کالج آف ریڈیو ایکالوجی کیریکٹر ہیں، انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کے نیوکلیو کریٹس کے رویوں کو یوں بیان کیا ''مٹی اور اشیائے خوردنی کے جو نمونے ریڈیو ایکٹویٹی ناپنے کے لیے مہیا کیے گئے تھے اچانک مقفل کر دیئے گئے۔ صلاح مشورے کے بعد انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی نے مجھ سے کہا کہ میں ان سے ٹیسٹ کے نتائج نہ مانگوں اس لیے کہ ایجنسی نہیں چاہتی کہ سیاسی مقاصد کے لیے ان نتائج کے ممکنہ استعمال میں ایجنسی فریق بنے۔''

سپریم سوویٹ کی ڈپٹی اور حادثہ چرنوبل کی تحقیقات کے لئے قائم کی گئی متعدد کمیٹیوں کی رکن ایلایاروچنسکایا نے ''چرنوبل۔ ممنوعہ سچ'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس خاتون نے کتاب میں جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ ہے ''چرنوبل کے بارے میں بولے گئے جھوٹ اتنے ہی ہولناک ہیں جتنی خود یہ آفت۔''

چرنوبل حادثہ کے بعد جرمنی کے صوبہ سار کے وزیر برائے ماحولیات نے اعلان کیا کہ ''فرانس میں ایٹمی ری ایکٹروں کے تحفظ اور معلومات کی فراہمی کے بارے میں جو رویے اختیار کئے گئے ہیں، وہ تشویش کا باعث ہیں۔'' 9 مئی 1986ء کو بون میں فرانسیسی سفارتخانہ نے یہ بیان جاری کیا ''چرنوبل سے اس کی دوری کی وجہ سے فرانسیسی علاقہ ریڈیو ایکٹو کے اخراج سے متاثر نہیں ہوا۔'' وزیر برائے ماحولیات نے مزید کہا کہ ''ڈیڑھ ہفتے کے بعد ہم نے جو جانچ پڑتال کی اس سے پتہ چلا کہ سارلینڈ اور خودمختار ریاست رائنی لینڈ میں ریڈیو ایکٹو کے ایک جگہ جمع ہونے کا تناسب معمول سے دو ہزار گناہ زیادہ تھا۔ جس وقت ہم لوگوں کو تازہ دودھ اور سبزیاں استعمال نہ کرنے کے بارے میں انتباہ کر رہے تھے تو اس وقت فرانسیسی حکام قطعی طور پر خاموش تھے اور ان کے عوام بالکل اندھیرے میں تھے۔ فرانس میں اخفا کی ثقافت اسی طرح انسان دشمن ہے جس طرح سوویت یونین میں سنسرشپ تھی۔''

''سچ کہاں ہے؟''

مکمل سچ کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ ہم برف کی چٹانوں کے صرف وہ حصے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیکھ سکتے ہیں جو سمندر سے ذرا سے باہر ہوتے ہیں۔ یوکرائن کے اس وقت کے صدر لیونڈ کراوَچک نے سوئزرلینڈ کے شہر ڈیووس میں منعقد ہونے والے عالمی اقتصادی فورم میں اعلان کیا تھا کہ ''چرنوبل حادثہ سے ایک کرڑو دس لاکھ افراد متاثر ہوئے تھے۔'' اس فورم میں کچھ دوسرے لوگوں نے بھی چند انکشافات کیے۔ ان میں کچھ درج ذیل ہیں:

ناروڈچی ڈسٹرکٹ ہسپتال کے چیف میڈیکل آفیسر لیونڈا چی چینکو نے کہا ''ہم نے اس ضلع میں کئی مرتبہ بچوں کا معائنہ کیا۔ ان میں سے 80 فیصد بچے تھائی رائیڈ ہائپر ٹرافی سے متاثر تھے۔''

ناروچی ڈسٹرکٹ پولی کلینک کے ڈائریکٹر الیگزینڈر ساچکو نے کہا ''ضلع کے تمام پانچ ہزار بچے آیوڈین 131 سے شعاع زدہ ہیں۔''

یوکرائن کے جریدہ ''کیوسک ویدوموستی'' نے لکھا کہ صرف فاراکوف ضلع میں 3633 افراد شعاع زدہ پائے گئے تھے۔

ستمبر 1962ء میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (ڈبلیو ایچ او) نے اعلان کیا کہ بیلارس میں تھائی رائیڈ کینسر میں مبتلا ہونے والے بچوں کی تعداد چوبیس گناہ ہوگئی۔ ڈبلیوایچ او کے عالمی پروگرام برائے چرنوبل حادثہ کے اثرات کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر ولفرائیڈ کریسل نے اعلان کیا ''ہم مکمل طور پر اس حقیقت کے بارے میں واضح ہیں کہ حادثہ کے بعد اس اضافہ کی وجہ یہی حادثہ ہے۔'' دو سال بعد یوکرائن میں تھائی رائیڈ کینسر میں مبتلا بچوں کی تعداد باسٹھ گناہ بڑھ گئی۔

حکومت روس کی قائم کردہ چرنوبل کمیٹی کے مطابق چرنوبل کے مقام کی صفائی میں حصہ لینے والوں میں سات ہزار افراد کے بعد سات برسوں میں جاں بحق ہوئے۔

ناروے میں ایک تحقیق کے مطابق 35263 حمل اور 23880 پیدائشوں سے پتہ چلا کہ حادثہ کے بعد ایک سال کے دوران اسقاط حمل کے واقعات میں 13.5 فیصد اضافہ ہوا۔

اس قسم کے بہت سے واقعات اور حقائق بیان کیے جا سکتے ہیں۔

اس شہادت کی روشنی میں یہ اہانت آمیز بات ہے کہ انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی حادثہ کے نتائج سے متعلق اصلی تحقیقی رپورٹ شائع کرنے میں بری طرح ناکام رہی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ اپنی اس دانستہ ناکامی کو چھپانے کی ضرورت 24 مئی 1993ء کو اس وقت ظاہر ہوگئی جب روزانہ شائع ہونے والے انرجی بلیٹن ''ایگزپریس'' نے بتایا کہ فرنچ نیوکلیئر انرجی سوسائٹی کے چیئرمین ژاں پال لینے گریس نے کہا ہے کہ ''چرنوبل میں صرف اکتیس اموات ہوئی تھیں۔'' مسٹر لینے گریس فراماٹوم کے نیوکلیئر فیول مینوفیکچرنگ ڈویژن کے ڈپٹی ڈائریکٹر بھی ہیں۔ یہ کمپنی فرانس کی نیوکلیائی صنعت کے لیے سامان تیار کرنے والی ایک بڑی کمپنی ہے۔ انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کے لیے باعث شرم ہونا چاہئے کہ وہ اب بھی ملتے جلتے اعداد و شمار ہی کا دعویٰ کرتی ہے۔

اگست 1992ء میں لل کے ایک بڑے ہسپتال کے دو ڈاکٹروں نے جو نیوکلیائی میڈیسن کے ذمہ دار ہیں، اخبار ''نوغہ الکلیئر'' کو دیئے گئے اپنے انٹرویو میں اصرار کیا ہے کہ چرنوبل کے بچوں کو صحت کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ انٹرویو ایک مضمون کا حصہ تھا جس کا عنوان تھا ''چرنوبل کے بچے ریڈی ایشن سے متاثر نہیں ہیں۔'' کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ جوہری فضلہ خاص نوعیت کے اثرات پیدا کرتا ہے۔ جوہری حادثے سے جو اموات پیدا ہوتی ہیں اور خطرناک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں ان کا شمار آسان نہیں، اس لیے کہ یہ ایک طویل عرصے میں ہوتا ہے اور یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے اسباب کیا ہیں۔ ریڈیو ایکٹو عناصر ہوا اور پانی کے ساتھ پھیلتے ہیں اور یوں ان کے اثرات جغرافیائی طور پر بہت دور تک پھیلتے ہیں۔ زمین کی آلودگی صدیوں تک رہتی ہے۔ پلوٹونیم کے بنیادی آئیسوٹوپ 24400 برسوں میں اپنی آدھی ریڈیو ایکٹویٹی ضائع کرتے ہیں۔

''چرنوبل کی ان دنوں کیا صورت حال ہے؟''

اسے محفوظ بنانے کی تمام تر کوششوں کے باوجود چرنوبل کا مقام اسی طرح ایک ہولناک خطرہ ہے۔ 1991ء میں ری ایکٹر نمبر 2 کو آگ لگنے کی وجہ سے بند کرنا پڑا اور حال ہی میں یہ معلوم ہوا ہے کہ ایک خاص قسم کے پتھر سارکوفیگس کنکریٹ کی دیوار جو ری ایکٹر نمبر 4 (جو حادثہ میں تباہ ہوگیا تھا) کے اردگرد کھڑی کی گئی تھی، ٹوٹ پھوٹ رہی ہے اور پتھر ریزہ ریزہ ہو رہا ہے۔ اسے گیلے سیمنٹ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اگر یہ دیوار گرگئی تو ملبہ سے جو ریڈیو ایکٹو خارج ہوں گے ان کی مقدار وہی ہوگی جو 1986ء کے حادثہ میں تھی۔

انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کی ایک معائنہ ٹیم کے مطابق باقی ماندہ دو ایٹمی ری

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایکٹروں کو چلانے میں جن تحفظات کی ضرورت ہے، ان میں متعدد کوتاہیاں موجود ہیں۔ اس کی وجہ صرف سرمائے کی کمی نہیں بلکہ یہ وجہ بھی ہے کہ سوویٹ یونین کے ٹوٹنے کے بعد وہاں سے کوئی ڈیڑھ سو اعلیٰ تربیت یافتہ کارکن (کل عملہ کا تقریباً 20 فیصد) ملازمتیں چھوڑ چکے ہیں۔ اس کے باوجود یوکرائن کے حکام پلانٹ کو بند کرنے پر رضا مند نہیں ہیں، جس کی درخواست بین الاقوامی نیوکلیائی ایجنسیوں نے کی ہے۔ یوکرائن کے پاس سرمائے کی کمی کے علاوہ بجلی حاصل کرنے کے متبادل ذرائع کی بھی کمی ہے اس لیے مغربی حکومتیں اس کی امداد کے لیے رضا مند شروع ہوگئی ہیں۔ تاحال وہ آٹھ سوملین ڈالر مہیا کرنے پر رضا مند ہوگئی ہیں لیکن اس رقم کو بہتر طور پر خرچ کرنے کے معاملہ پر تضادات پائے جاتے ہیں۔

یوکرائن حکومت کا کہنا ہے کہ جب تک وہ پانچ نئے وی وی ای آر-1000 نیوکلیئر ری ایکٹر کی تعمیل نہ کرلے اس وقت تک چرنوبل کو بند نہیں کیا جا سکتا اور ان پر کام اس لیے رکا ہوا ہے کہ ایک تو فنڈز نہیں اور دوسرا سیاسی وجوہات کی بنا پر ان پر ہونے والا کام بند پڑا ہے۔ یوکرائن حکومت کی حمایت، ظاہر ہے کہ مغرب کی نیوکلیئر کمپنیاں کرتی ہیں اس لیے کہ تعمیر شروع ہوگی تو ان کمپنیوں کے لیے کمائی کے شاندار مواقع ہوں گے۔ بہرحال تحفظ کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ وی وی ای آر 1000 کے ڈیزائن سے متعلق ہے۔ 1993ء میں انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کو سولہ ایسے علاقے ملے جہاں وی وی آر 1000 کے ڈیزائن کو معمول کے حفاظتی معیار، جن میں آگ لگنے کا خطرہ، دباؤ والے سٹیل کے ویسلر کے ٹوٹنے اور ریڈیو ایکٹو کے اخراج کو روکنا وغیرہ شامل ہیں، پر پورے نہیں اترتے۔

"اگر وی وی ای آر 1000 کارخانے مکمل نہیں ہوتے تو پھر یوکرائن
اپنی توانائی کی ضروریات کس طرح پوری کرے گا؟"

اس کا بہتر دانشمندانہ حل تو یہ ہوگا کہ انرجی ایفی شینسی کے لیے اس امکان کو دیکھا جائے جس کی نشاندہی امریکہ کے محکمہ توانائی نے اپنی رپورٹ میں کی ہے۔ اس میں دیئے گئے اعداد وشمار پر یوکرائن حکومت نے اتفاق کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جی 7 ممالک جس منصوبے کی حمایت کرتے ہیں (چرنوبل کو بند کرکے پانچ وی وی ای آر 1000 قائم کرنا) وہ ایک انتہائی مہنگا انتخاب ہے اور اس سے شکوک پیدا ہوتے ہیں کہ آیا 800 ملین ڈالر کی رقم چرنوبل کے موجودہ ری ایکٹروں کو بلند کرنے کے لیے کافی ہوگی۔ امریکہ کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

محکمہ توانائی کا کہنا ہے کہ 1999ء تک پانچ وی وی ای آر 1000 پانچ ہزار میگا واٹ بجلی پیدا کریں گے اور اس بجلی کی فی کلو واٹ گھنٹہ قیمت 3 سے چار امریکی سینٹ ہو گی۔ اسی مدت میں یعنی 1999ء تک انڈسٹریل انرجی ایفی شینسی میں بنیادی اصلاح کی وجہ سے 4250 میگا واٹ بجلی بچائی جا سکے گی اور اس پر فی کلو واٹ گھنٹہ قیمت ایک سے دو سینٹ ہو گی۔ پن ٹربائنوں کے موجودہ منصوبوں کی تعمیر جلد مکمل کرنے اور موجودہ ہائیڈرو الیکٹرک پلانٹس کو بہتر بنانے سے دو ہزار میگا واٹ اضافی بجلی مہیا ہو گی، جس کی فی کلو واٹ گھنٹہ قیمت دو سے تین سینٹ ہو گی۔ اس کے علاوہ یوکرائن کے کوئلہ سے چلنے والے چودہ بجلی گھر دو ہزار میگا واٹ اضافی بجلی کہیں کم قیمت پر پیدا کر سکتے ہیں۔ یوکرائن کو اس وقت اپنے پر اقتصادی پیداواری یونٹ کے لیے او ای سی ڈی کی نسبت چار گناہ زیادہ بجلی کی ضرورت ہے۔ انرجی ایفی شینسی میں اضافہ، توانائی کے قابل تجدید ذرائع کے استعمال اور حرارت اور قوت سے چلنے والے بجلی گھروں کے استعمال سے نہ صرف یہ کہ چرنوبل کا مسئلہ طے کرنے میں مدد ملے گی بلکہ یوکرائن کی پوری معیشت کو اس سے فائدہ پہنچے گا، اس کے علاوہ اس عمل کی وجہ سے روزگار کے اچھے مواقع بھی مہیا ہوں گے۔ بین الاقوامی نیوکلیو کریسی نے عزم کر رکھا ہے کہ وہ یہ کام نہیں ہونے دے گی۔

لیکن ایک نیوکلیو کریٹ ایسا ہے جو صحیح سمت کی طرف جا رہا ہے۔ فرانسیسی نیوکلیئر گروپ ''کوجیما'' کے چیئرمین ژاں سیروٹا نے تسلیم کیا ہے کہ چرنوبل قسم کے ری ایکٹر سادہ تکنیکی طریقے سے بند کیے جا سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بجلی کے استعمال میں آپ زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کریں۔ مشرقی یورپ میں بجلی کا استعمال خوفناک حد تک پہنچ چکا ہے، اس لیے کہ ان ملکوں میں بجلی تقریباً مفت مہیا ہوتی ہے اگر بجلی کی حقیقت پسندانہ قیمت مقرر کر دی جائے تو اس کا بے مقصد استعمال رک جائے گا اور پھر ہمیں خطرناک ایٹمی بجلی گھروں سے فراہمی کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

''روس اور مشرقی یورپ ممالک کی مدد کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

ہمیں فنی اور مالی ذرائع سے ان کی مدد کرنی چاہیے تاکہ وہ اپنے ایٹمی توانائی کے نظام کو ختم کر کے توانائی کے قابل تجدید ذرائع کے استعمال میں اضافہ کر سکیں۔ توانائی کے استعمال کو بہتر بنا سکیں اور گیس ٹربائن استعمال کے لئے حرارت اور قوت والے بجلی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گھروں کو استعمال میں لاسکیں۔ ان ٹربائنوں میں جو فی الحال فوجی ہوا بازی کے لیے تیار ہوتی ہیں، چھوٹی موٹی تبدیلی کی جانی چاہئے اور فوجی ہوا بازی کے لیے استعمال ہونے والی ٹربائنیں تیار کرنے والی صنعت کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ روس میں قدرتی گیس وافر مقدار میں ہے۔ اس قسم کے بجلی گھر مہنگے نہیں ہوں گے۔ یہ تیزی کے ساتھ تعمیر کیے جاسکتے ہیں اور انہیں قصبوں اور فیکٹریوں کے قریب ہی نصب کیا جاسکتا ہے۔

لیکن یہ سب کچھ کرنے کے لیے ہمیں مغربی نیوکلیوکریسی سے لڑنا ہوگا۔ جہاں تک نیوکلیوکریٹس کا تعلق ہے تو مغربی ممالک میں نیوکلیائی انڈسٹری کی ناکامی کو مغرب میں نیوکلیائی صنعت سے نجات کا ذریعہ کہا جاسکتا ہے۔ اگر مغربی نیوکلیوکریٹس ہمیں قائل کرلیں کہ مشرقی یورپ کے مسائل محض کمیونسٹوں کی نااہلی کا مظہر ہیں تو انہیں سونے کا خزانہ مل جائے گا۔ وہ مشرقی یورپ کی نیوکلیائی انڈسٹری کو مغربی ملکوں کے ٹیکس دہندگان کی قیمت پر دوبارہ مسلح کرنا شروع کردیں گے اور اسی طرح اپنی انڈسٹری میں دوبارہ جان ڈالنے کے قابل ہو جائیں گے۔ یہ کوئی حادثہ نہیں ہے کہ وہ مغربی ادارے جو روس اور مشرقی یورپ میں توانائی کے مسائل کو حل کرنے کے ذمہ دار ہیں، ان پر کنٹرول نیوکلیوکریٹس کا ہے۔

''اور مغربی یورپ میں کیا صورت حال ہے؟''

مغربی نیوکلیوکریٹس ہمیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ حفاظتی مسائل صرف مشرق میں ہیں۔ حقیقت میں فرانس اور دوسرے ملکوں میں حفاظت سے متعلق متعدد واقعات سامنے آئے ہیں۔ دراصل یہ اس عمل میں موجود خطرات کی علامات ہیں جو انتہائی خطرناک ہیں اس لیے کہ ان کے نتائج تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ فرانس میں اس کی حالیہ مثال کیدراچے ری ایکٹر کامپلکس میں ہونے والا ہلاکت خیز حادثہ ہے جس میں ایک انجینئر ہلاک اور اس کے چار ساتھی شدید زخمی ہوگئے جو ایک مخفی لیکوئڈ سوڈیم ری ایکٹر کو بند کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ 31 مارچ 1994ء کو جو دھماکہ ہوا اس میں ریسپوڈائی ری ایکٹر سے ملی ہوئی کنکریٹ کی چھت اڑگئی جس پر 37 ٹن سوڈیم موجود تھی۔

1990ء میں الیکٹرسٹی ڈو فرانس کے انسپکٹر جنرل پیری ٹنگوئے نے اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھا کہ ''آج سب سے بڑا خطرہ دنیا بھر میں استعمال ہونے والے کمرشل لائٹ واٹر ری ایکٹروں میں ایک یا زیادہ سٹیم جنریٹر ٹیوبوں میں اچانک رکاوٹ پیدا ہونا ہے۔ سٹیم

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جنریٹر نیوکلیائی ری ایکٹر میں حرارت کو تبدیل کرنے والے وہ بڑے بڑے آلات ہیں جن میں ہزاروں ٹیوبیں ہوتی ہیں جن کے ذریعے ٹھنڈا کرنے والا مائع گردش کرتا ہے۔ ان میں سے اگر کوئی ٹیوب ٹوٹ جائے یا اس میں کوئی رکاوٹ آ جائے تو ٹھنڈا کرنے کا ایمرجنسی نظام کام کرنا بند کر دیتا ہے۔ اس سے پانی بھی ٹھنڈا ہو سکتا ہے جسے سیفٹیو الوز کے ذریعے ری ایکٹر میں سے نکالا جا رہا ہوتا ہے۔ اس سے خطرناک حادثہ کا امکان ہوتا ہے اس لیے کہ ریڈیو ایکٹویٹی کا بہت زیادہ اخراج شروع ہو جاتا ہے۔ اب تک پوری دنیا میں اس قسم کے گیارہ واقعات ہو چکے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ جو ریڈیو ایکٹویٹی خارج ہو رہی ہو، اس کی مقدار محدود ہو لیکن سٹیم جنریٹروں کی حالت فوری نوعیت کا مسئلہ بن چکا ہے۔ فرانس نے چوبیس ری ایکٹروں میں سٹیم جنریٹروں کو بدل دینے کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن تا حال صرف ڈیم پیرے I، بگی 5 اور کربولائنز I ری ایکٹروں پر کام مکمل ہوا ہے۔ سوئیزرلینڈ، جرمنی، سویڈن اور بلجیم میں بھی سٹیم جنریٹروں کو بدلا جا رہا ہے۔

ایک اور خطرہ ویسل ہیڈ ہے۔ ستمبر 1991ء میں فرانسکے بگی۔3 ری ایکٹر کے ویسل ہیڈ سے اخراج کا پتہ چلا۔ معلوم ہوا کہ اس کی وجہ سوراخ میں پڑنے والی دراڑیں تھیں۔ یہ سوراخ اہم کردار ادا کرتے ہیں اس لیے کہ ری ایکٹر ویسل میں کنٹرول دراڑ انہی سوراخوں کے ذریعے داخل کی جاتی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک سوراخ میں دباؤ پیدا ہونے سے ایک یا دونوں حادثے ہو سکتے ہیں، یعنی ٹھنڈا کرنے والے مائع کا نقصان اور ری ایکٹر کو بند کرنے والے نظام کو نقصان۔ اس لیے کہ اگر ٹھنڈا کرنے والا مائع ضائع ہو جائے تو اس سے کور (Core) پگھلنے لگتا ہے۔

اس انکشاف کے تقریباً دو برس بعد اگست 1993ء تک فرانس کے متاثرہ آدھے ری ایکٹروں کا مکمل معائنہ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ جن چوبیس کا معائنہ کیا گیا ان میں سے پندرہ ری ایکٹروں میں دراڑیں پائی گئیں۔ سویڈن، سوئیزرلینڈ اور بیلجئم کے ری ایکٹروں میں سبھی انہی مسائل کی نشاندہی کی گئی۔ مزید برآں مئی 1993ء میں سویڈن کے رنگھال۔2 ری ایکٹر میں 18 ملی میٹر لمبے اور چار ملی میٹر گہری گول دراڑیں پائی گئیں۔ اس قسم کی دراڑ خاص طور پر انتہائی خطرناک ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ٹوٹ پھوٹ سے پہلے کسی قسم کا اخراج نہیں ہوتا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی انتباہ کے بغیر ہی اس کے حصے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک اور نوعیت کا مسئلہ بھی ہے۔ مئی 1992ء میں الیکٹرسٹی ڈو فرانس کو سرکاری طور پر بتایا گیا کہ ڈیم پیرے۔I ری ایکٹر پر کام کرتے وقت ٹھیکیدار نے چند دستاویزات ہوا کہ سب کنٹریکٹر نے کوالٹی کنٹرول کے لیے استعمال ہونے والی ایکس ریز کو بدل دیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈیم پیرے کے چار ری ایکٹروں میں سے تین کے کم از کم پندرہ جوڑ خراب تھے۔

''موجودہ ایٹمی بجلی گھروں کا مستقبل کیا ہوگا؟''

کوئی بھی بڑا تجارتی ایٹمی بجلی گھر جو کئی برسوں سے نیوٹرون کے بہاؤ کا سامنا کرتا رہا ہے اور اس وجہ سے بری طرح آلودہ رہا ہے، نہ تو کبھی بند کیا گیا نہ ہی اسے اکھاڑا گیا۔ اس قسم کے بجلی گھروں کو کیسے بند کیا جاتا ہے، اس کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں، اس لیے کہ ابھی تک صرف تحقیقی ری ایکٹروں کو بند کیا گیا اور تجارتی ری ایکٹر بند نہیں کیے گئے۔ متعدد مثالوں میں سے میں نے صرف غیر متوقع میٹالرجیکل مسائل کی مثالیں پیش کی ہیں جو فولاد کی مختلف اقسام اور دوسری ملاوٹی دھاتوں کے طویل عرصے تک ریڈی ایشن، حرارت، تھرتھراہٹ اور کیمیاوی حرارت کا مقابلہ کرتے رہنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

فراماٹون جیسی کمپنیوں کی مستقبل کی آمدنی کا بڑا ذریعہ سپئیر پارٹس ہیں۔ ان کا تجارتی مستقبل بڑا خوشحال ہے۔ اس کی وجہ انڈسٹری کی صحت نہیں بلکہ موجودہ بجلی گھروں کے لیے سپئیر پارٹس کی بڑے پیمانے پر فراہمی کے آرڈر ہیں۔ بہرحال اہم واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ کینیڈا کی بجلی کی ایک بڑی کمپنی اونٹاریو ہائیڈرو نے اپنی نیوکلیئر اہلیت کے بڑے حصہ کو مرمت کرنے کی بجائے بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ امریکہ میں یانکی روو، ٹروجن اور رانچوسیکو جیسے ایٹمی بجلی گھر بند کیے جا رہے ہیں۔ مزید برآں گیارہ دوسرے تجارتی بجلی گھروں کو بھی بند کرنے کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ یہاں بھی مسئلہ تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی لاگت ہے۔ یانکی روو کو بند کرنے کی لاگت کا تخمینہ 116.6 ملین ڈالر سے بڑھ کر 247.1 ملین ڈالر تک پہنچ گیا ہے۔ اسی طرح رانچوسیکو پر اخراجات کا تخمینہ 126.5ء ملین ڈالر تھا جو اب بڑھ کر 292.9 ملین ڈالر ہو گیا ہے۔

''پلوٹونیم کی بین الاقوامی تجارت میں ہونے والے حالیہ تغیر و تبدل کے بارے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں ہمیں بتایئے؟‘‘

پوری دنیا میں اس وقت ایک ہزار ٹن پلوٹونیم کا سٹاک موجود ہے۔ اس میں سے ایک سو چالیس ٹن ایٹمی بم بنانے کے لیے بہترین مانا جاتا ہے۔ باقی بھی استعمال کے لیے ٹھیک ہے۔ پچپن برس قبل کچھ بھی نہیں تھا۔ پلوٹونیم انسان نے خود بنایا ہے۔ امریکی محکمہ دفاع کے لیے رینڈ کارپوریشن نے جو تحقیقی رپورٹ تیار کی، اس کے مطابق دس برس کے اندر دنیا میں اتنی مقدار میں پلوٹونیم موجود ہوگا جس سے 87000 نیوکلیائی ہتھیار تیار کئے جا سکیں گے۔

بنیادی طور پر پلوٹونیم تیار کرنے کا مقصد پرامن تھا اور وہ یہ کہ تیز رفتار نیوکلیائی ری ایکٹروں کے لئے اسے ایندھن کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ نیوکلیوکریٹس بھی یہ ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ تیز رفتاری کے ساتھ کام کرنے والے نیوکلیائی ری ایکٹر خطرناک اور معیشت پر بوجھ ہیں۔ ان میں سے ڈون ری اے (سکاٹ لینڈ) اور جرمنی کے کالکر ری ایکٹر جیسے کچھ بند کیے جا رہے ہیں۔ فرانس میں سپر فینکس کو تجرباتی مرکز میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ درحقیقت یہ چیز فرانسیسی نیوکلیوکریٹس کے لیے محض شرمندگی سے بچنے کی کوشش ہے اس لیے کہ یہ لوگ اس بجلی گھر کو چلانے کے لیے لڑتے ہیں۔

برطانیہ میں ریاستی ملکیتی کمپنی برٹش نیوکلیئر فیولز نے کمبریا کے سیلافیلڈ کے علاقے میں تھرمل آکسائڈ ری پراسیسنگ پلانٹ لگایا تھا۔ اس کا مقصد ایٹمی بجلی گھروں سے خارج ہونے والے جلے ہوئے ایندھن میں سے پلوٹونیم اور یورینیم کو الگ کرنا تھا تاکہ تیز رفتاری ایکٹروں میں پلوٹونیم کو ایندھن کے طور پر دوبارہ استعمال میں لایا جا سکے لیکن تیز رفتاری ری ایکٹروں کے بند ہونے کی وجہ سے پلوٹونیم کی مارکیٹ خاصی کم ہو گئی ہے۔ دوسری طرف مجرموں کے ہاتھوں بم فروخت کرنے کا کاروبار تیزی کے ساتھ فروغ پا رہا ہے۔

’’تو پھر تھارپ (تھرمل آکسائڈ ری پراسیسنگ پلانٹ) کو کیوں جاری رکھا جائے؟‘‘

اس کی وجوہ اقتصادی نہیں ہیں۔ یہ پلانٹ یہ مسئلہ حل نہیں کرتا کہ جلے ہوئے نیوکلیائی ایندھن کا کیا انتظام کیا جائے۔ اس لیے کہ ری پراسیسنگ کے دوران ضائع ہونے والے ایندھن کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے۔ ری پراسیسنگ کے دوران ضائع ہونے والے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایندھن کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے۔ ری پراسیسنگ کی بجائے خشک سٹوریج بہتر طریقہ ہے اور سکاٹش نیوکلیئر نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ وہ اپنے استعمال شدہ نیوکلیائی ایندھن کو تھارپ کو بھیجنے کی بجائے اس کا خشک ذخیرہ کرے گی۔ جرمن یوٹیلیٹیز نے تخمینہ لگایا ہے کہ وہ اپنے لاہیگ میں استعمال شدہ ایندھن کی ری پراسیسنگ کو بند کر کے 3.5 بلین ڈش مارک بچا سکے گا۔

تھارپ کی اور بھی قباحتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ اسے بند کرنے پر جو لاگت آئے گی وہ کم از کم نو سو ملین پنڈ ہو گی اور کچھ تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ لاگت اس سے کہیں زیادہ ہو گی۔ دوسری یہ کہ پلانٹ سمندر اور فضا دونوں میں ریڈیو ایکٹو زیادہ مقدار میں پھیلائے گا۔ آئرلینڈ کا سمندر اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ آلودہ سمندر ہے۔ اس لیے آئرش حکومت برطانوی حکومت سے تھارپ کو نہ کھولنے کے لیے مذاکرات کر رہی ہے۔ فضا میں میڈیکل آسپکٹس آف ریڈی ایشن اور محکمہ صحت پر بنائی گئی دونوں کمیٹیوں نے حکومت کی طرف سے مہیا کی گئی طبی معلومات پر سخت تنقید کی ہے اور پھر آخر میں یہ کہ تھارپ پلوٹونیم میں اضافہ کے مسئلہ کو بڑھائے گا۔ برطانوی حکومت اڑ گئی ہے اور وہ یہ تسلیم کر کے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی کہ تھارپ وہ سفید ہاتھی ہے جس پر 2.8 بلین پنڈ خرچ ہو چکے ہیں چنانچہ یہ پلانٹ اب چل رہا ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب 7

کیوں؟

"گفتگو کے دوران آپ نے جدید معاشرے کو درپیش متعدد بنیادی مسائل کا ذکر کیا اور کچھ حل تجویز کیے۔ یہ فرمائیے ہمیں تہذیبی بحران کا سامنا کیوں ہے؟"

ہم ایک عہد کے اختتام پر پہنچ چکے ہیں۔ ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہم کہاں ہیں، ہم نے کیا کامیابیاں حاصل کیں اور ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ہم خود کو درپیش مسائل کو اسی طرح حل کر سکتے ہیں جس طرح کرتے چلے آئے ہیں۔ البتہ اب پہلے والا عمل زیادہ موثر طریقے سے کرنا چاہئے۔ ان کو یقین ہے کہ ہم صحیح سمت کی طرف جا رہے ہیں لیکن اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہم کو اپنی کوششیں دوگنی کر دینی چاہئیں۔ میں ان سے تین سوال کرتا ہوں۔ صنعتی، انقلاب کی پیدائش کے دو سال بعد، جس کے دوران بہت زیادہ اقتصادی ترقی ہوئی لیکن لوگوں کی اکثریت دکھ اور تکلیف میں زندگی بسر کر رہی ہے، یہ کیسے ہوا کہ دنیا بھر میں گندی بستیوں میں رہنے والی آبادی میں عالمی سطح پر آبادی میں اضافہ سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ اضافہ ہوا؟ اور یہ کیسے ہوا کہ ٹیکنالوجی میں ناقابل یقین ایجادات کے باوجود دنیا اس وقت جنگوں، قحط، متعدی امراض اور سابقہ صدیوں کے دوسرے عذابوں سے مختلف نوعیت کے ایسے خطرات سے دوچار ہے جو انسان کے اپنے پیدا کردہ ہیں؟

موسم کی تبدیلی نے زندگی کے استحکام کے لیے خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ اوزون کی پرت کی تباہی سورج کی روشنی کو جان لیوا اندھیروں میں تبدیل کر سکتی ہے۔ تازہ پانی اور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سمندری پانی دونوں ہی زہر آلود رہے ہیں۔ زمین اور مٹی کو بگاڑا جا رہا ہے۔ بہت سے علاقوں میں سانس کے لیے ہوا خطرناک بنتی جا رہی ہے۔ خوراک جو ہم کھاتے ہیں زہر آلود کیمیاوی مادوں کے ساتھ آلودہ کی جا رہی ہے اور جیسا کہ اقوام متحدہ کے مشیر ماحولیات مورس سٹرانگ کا کہنا ہے کہ ہم چرنوبل قسم کے چالیس حادثات کے رونما ہونے کے خطرہ میں جی رہے ہیں۔

یہ کیسے ہوا کہ مادی خوشحالی کے عظیم تر دور کا نتیجہ سماجی ڈھانچے کے تاروپود بکھرنے کی صورت میں سامنے آیا اور فنی و سائنسی کامیابی کا عظیم تر دور زمین پر زندگی کے لیے خطرے کا باعث بن گیا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی پہیلی ہے جسے ہم کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

''ان سوالوں کے آپ کے پاس کا جوابات ہیں؟''

جدید مغربی معاشرے کے رویہ اور اس کی کامیابیوں کو سمجھنے کے لیے ہم کو اس کے کلچر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ بنیادی طور پر اس کے مذہب کی بنیاد اس بات پر ہے کہ خدا ایک ہے، جو خالق ہے اور یہ کہ آدمی اس کا عکس ہے، اسکا پرتو ہے اور زمین پر صرف آدمی ہی خدا کی تجسیم ہے اور یہ کہ آدمی مختلف ہے، جدا ہے اور زندگی کی دوسری تمام صورتوں کی نسبت اس کا مقام اعلیٰ ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ فطرت انسان کے تصرف میں دی گئی ہے۔

یہ بات ابتدائی انسانوں کے مذہبی نقطہ نظر سے قطعی مختلف ہے۔ وہ انسان کو اس کے اردگرد کے جاندار اور غیر جانبدار قوتوں سے الگ کر کے نہیں دیکھتے تھے۔ ان ابتدائی سماجوں میں مرد اور عورتیں فطرت کی قربت، احتیاط اور تنظیم کے ساتھ حاصل کرتے تھے۔ ابتدائی دنیا میں فطرت کے ساتھ آدمی کا رشتہ استحصال کا نہیں بلکہ ہم آہنگی کا تھا۔ جدید مغربی روایت میں فطرت ایک ایسی چیز بن کر رہ گئی ہے جس کی تحقیق ضروری ہے، جس کی وضاحت لازمی ہے اور آخر کار اسے استعمال میں لایا جانا ضروری ہے۔

بودھ اور روایتی ہندو کا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے سماج کے مسائل کی بنیاد اس فرق میں ہے جو آدمی اور فطرت کے درمیان ہم سمجھتے یا محسوس کرتے ہیں۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ فطرت سے آدمی کی علیحدگی کی وجہ یہودیت اور عیسائیت کی روایت کا بنیادی تصور ہے اور اس حوالے سے فطرت، انسان کی مرضی اور اس کی جارحانہ جبلت کے تابع ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''مارکسزم اور لینن ازم اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

مارکس اور لینن نے روحانی اقدار کو مسترد کیا اور سائنس و ٹیکنالوجی میں تمام تر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ مارسکزم کے مطابق فطرت سے تمام غیر محدود کام لینا جائز ہے لیکن صرف انسان کی خدمت کی خاطر۔

''کیا روشن خیال فلسفیوں نے اس قسم کے تصور کی بنیاد نہیں رکھی تھی؟''

یقیناً ایسا ہی تھا۔ روشن خیال فلسفیوں کے بنیادی عقیدے یہی تھے کہ روایت اور تعصب سے آزاد انسانی شعور انسان کو مذہب، تاریخ اور فطرت کی پابندیوں سے آزاد کر سکتا ہے اور اسے کرنا چاہئے۔ دوسرے لفظوں میں روشن خیالی ایسی اخلاقیات قائم کرنا چاہتی تھی جو روحانی تصورات سے کٹی ہوئی اور اس کی بنیاد محض عقلیت پر ہو۔ خیال تھا کہ اس سے انسان ان تمام پابندیوں سے آزاد ہو جائے گا جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

بشری تفاخر اور عقلیت پسندی کا ملاپ، جس پر روشن خیالی کا دارومدار تھا، جدیدیت کی نمایاں تصور کی بنیاد تھا جس نے مارکسزم کی طرف رہنمائی کی۔ تمام اہم روشن خیال تصورات یعنی انسان کا شرف انسانیت سائنسی استدلال کی سند نشینی، عالمی تہذیب کی تجویز، ہر قسم کے مذہب سے انسانوں کی آزادی وغیرہ، مارکس کی فکر میں واضح طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ حقیقت میں مارکس کے تصورات روشن خیالی کے موضوعات کا امتزاج پیدا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مغربی دانشوروں کو ان تصورات نے سحر زدہ کر دیا۔

''اس حوالے سے آپ عقلیت پسندی کی تعریف کیا کریں گے؟''

عقلیت پسندی کا تعلق سائنس کے ساتھ ہے اور سائنس کو ایک آلہ سمجھا جاتا ہے جس کے ذریعے انسان فطرت کو اپنے قابو میں کر سکتے ہیں۔ جدیدیت کے اہم فلسفی رینے دیکارت کہتے ہیں کہ انسان کو فطرت کا حاکم ہونا چاہئے اور فطرت ان کے تصرف میں ہونی چاہئے۔ رینے دیکارت سائنس کو ایک ضروری آلہ سمجھتے تھے۔ انگلستان کے روشن خیال دانشور فرانسس بیکن کا کہنا تھا کہ سائنسی طریقے سے سامنے آنے والے حقائق کی کوئی اخلاقی اہمیت نہیں ہوتی۔ چنانچہ سائنس فطرت کو استعمال کرنے آزاد ہے اور ایسا کرنے میں کوئی اخلاقی ممانعت نہیں ہے۔

فطرت سے انسان کے الگ ہونے کا ایک نتیجہ دنیا کے ایک ایسے تصور کی تخلیق کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صورت میں نکلا جس میں ایک طرف تو انسانی آگہی یا ادراک اور دوسری طرف مادہ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیکارت نے کہا کہ چونکہ جانوروں کے پاس ادراک نہیں اس لیے نہ تو وہ سوچتے ہیں اور نہ ہی محسوس کرتے ہیں۔

انسانی عقلیت کی مطلق شکل میں سائنس کے استحکام کا ناگزیر نتیجہ انسانی علم کی تمام دوسری ہیئتوں۔ اخلاقی، مذہبی اور روایتی۔ کی تذلیل کی صورت میں ن کلا۔ ثقافتی و تہذیبی زندگی میں یہ غیر اہم ہو کر رہ گئے۔ چونکہ سائنس کو اخلاقیات سے الگ کر دیا گیا تھا اس لیے وہ کسی رکاوٹ کے بغیر اپنے طور پر ترقی کرتی رہی۔ چنانچہ وہ معاشرے سے آزاد ہو کر سفر کرتی رہی اور اس کے بارے میں یہی یقین رہا کہ اس کا حق اور فرض ہے کہ وہ تحقیق کرے، ایجاد کرے اور اختراع کرے۔

آج بھی یہ تصورات ہمارے معاشرے کا محور ہیں۔ حال ہی میں ''معاصر دستاویزات'' کے سلسلے میں شائع ہونے والا ایک کتابچہ مجھے ملا ہے۔ اس میں یونیورسٹی کالج لندن کے شعبہ اناٹوجی اور بیالوجی کے استاد اور ممتاز سائنس دان لیوس وولپرٹ نے سائنس کے فضائل بیان کیے ہیں۔ پروفیسر وولپرٹ رائل سوسائٹی کے فیلو اور پبلک انڈرسٹینڈنگ آف سائنس کے لیے کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔

انہوں نے بڑے دلچسپ نکات پیش کیے ہیں۔ روایتی کاشتکاروں کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ کاشتکار تجربے پر انحصار کرتے اور اپنی غلطیوں سے سیکھتے ہیں۔ یہ تحصیل ہنر ہے جس کی بنیاد علم پر ہے اور سائنس کے برعکس یہ عقل سلیم سے جڑا ہوا ہے۔ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ ایسی اختراع کو آلات استعمال کرنے کے لیے چمپیزی کی اہلیت کی وسعت سے ممیز کیا جائے۔

فن تعمیر پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ نشاۃ ثانیہ کی عمارتیں سائنسی اصولوں پر تعمیر نہیں کی گئی تھیں بلکہ ان کی تعمیر عملی تجربے کی بنیاد پر کی گئی تھی۔ پانچ منٹ کے کلیہ پر ان کا انحصار تھا۔ جب سہارے ہٹائے جاتے تو عمارت پانچ منٹ کے لیے کھڑی رہتی جبکہ تصور کیا جاتا تھا کہ یہ ہمیشہ کھڑی رہے گی۔

زراعت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر وولپرٹ لکھتے ہیں کہ اگر کوئی تجربہ کیا جا سکتا ہے تو وہ ضرور ہوگا۔ اگر عمل میسر ہے تو پھر اس کا استعمال بھی ہوگا۔ جب بھی نئی ٹیکنالوجی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

متعارف کرائی جاتی ہے تو یہ سائنس دانوں کا کام نہیں کہ وہ اخلاقی فیصلے کریں۔

یہ کتابچہ روشن خیال فلسفہ کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں روایتی کاشتکاروں اور ماہرین فن تعمیر کے لیے توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ فطرت پر انسان کی برتری کے تیقن کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر وولپرٹ حیرت سے کہتے ہیں کہ ''جنیٹک انجینئرنگ کے ذریعے مختلف قسم کے اعضاء کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانے سے ہم کیوں خوفزدہ ہوتے ہیں۔'' فطرت اس قسم کے ملاپ کو مسترد کرتی ہے۔ ایک دوسرے سے قطعی مختلف قسم کے جانور ایک دوسرے کے ساتھ ملاپ سے نسل نہیں بڑھا سکتے۔ لیکن مختلف نسلوں کے ایسے جانور جو ایک دوسرے کے قریب ہیں، مثال کے طور پر گھوڑا اور گدھا یا شیر اور چیتا، یہ ایک دوسرے کے ساتھ ملاپ سے خچر وغیرہ پیدا کرسکتے ہیں۔ لیکن پیدا ہونے والے یہ جانور بانجھ ہوتے ہیں۔ سائنس اس قدر کم رفتار ارتقاء کو مسترد کرتی ہے۔ یہ فوری تبدیلی چاہتی ہے۔ یہ خود کو فطرت سے اعلیٰ تصور کرتی ہے تو پھر یہ فطرت کے اصولوں کو کیوں مدنظر رکھے۔

جدیدیت پسند یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ہر دور کی نسل کا فرض ہے کہ وہ ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان رابطہ رکھے۔ وہ خود کو تسلسل کے محافظ و سرپرست نہیں بلکہ تسلسل کے ساتھ تیز رفتار تبدیلی کے ایجنٹ سمجھتے ہیں اور اس کے امکانی نتائج کے بارے میں عارضی طور پر سوچتے ہیں۔

''روشن خیالی عالمی تہذیب میں یقین رکھتے تھے؟''

جی ہاں۔ انسان اور شعور کی ماورائے ادراک فضیلت پر اپنے عقیدے کے ساتھ ساتھ ایک عالمی تہذیب روشن خیالی کا تیسرا اہم جزو ہے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ ثقافتی ایک سریع الزوال عمل سے زیادہ کچھ نہیں جو عالمگیر انسانیت کی طرف ہمارے ارتقاء کے دوران وقوع پذیر ہوتا ہے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ ثقافتی رنگا رنگی، عالمی تہذیب میں معمولی باقی ماندہ عناصر بن کر رہ جائے بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ثقافتی فرد جدید مغربی شہروں میں موجود نسلی غیر ہم آہنگی کی شکل اختیار کرلیں گے۔ عالمی تہذیب کا مطلب یہ ہے کہ مختلف ثقافتوں کی افراط کی حیثیت چھوٹے چھوٹے ندی نالوں سے زیادہ نہیں جن کی تقدیر ہی یہ ہے کہ وہ عالمی معاشرے کے سمندر میں شامل ہو جائیں۔

''آپ کا خیال ہے کہ یہ عقیدہ ابھی باقی ہے؟''

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بالکل۔ ثقافتی سامراج ابھی پوری طرح باقی ہے۔ اس کی تازہ ترین مثالیں GATT اور صومالیہ ہیں۔ ثقافتی سامراج علاقائی توسیع پسندی سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ لاطینی امریکہ میں طاقت کے ذریعے مفتوحہ بنانے والوں نے لوٹ مار کی، عورتوں کے ساتھ زیادتی کی اور گھروں کو واپس بھاگ گئے۔ انہوں نے لاطینی امریکہ پر کاری زخم لگائے۔ ان کے بعد آنے والے مبلغین لوٹ مار کے ذمہ دار تھے۔ انہوں نے تمام قوموں کو ان کی زبان، شناخت اور مذہب سے محروم کر دیا۔

روشن خیالی کے نام لیوا آزاد خیال لوگ آج بھی سمجھتے ہیں کہ اگر دنیا صرف جمہوری ملکوں پر مشتمل ہو تو پھر کوئی جنگ نہیں ہو گی۔ اس لیے کہ مختلف قسم کی حکومتیں امن و سکون کے ساتھ یکجا نہیں رہ سکتیں۔ چنانچہ روشن خیال مفکروں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دنیا بھر میں ثقافتی ہم آہنگی امن کی بنیاد ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر وہ گروہ جو مغرب کے ہاتھوں اپنی ثقافت کی تباہی کی مزاحمت کرتا ہے، امن کے لیے خطرہ ہے۔

''روشن خیالی کی اہم کامیابیاں کیا تھیں؟ اور اس کی ناکامیاں کیا ہیں؟''

اس فکر کی سب سے اہم کامیابی سائنسی علم کا فروغ اور اس کے نتیجے میں جدید ٹیکنالوجی کی ترقی ہے۔ اس کی غلطی استدلال کا عروج ہے جو سائنس، ٹیکنالوجی اور پیداوار میں نتیجہ کے طور پر مجسم ہے۔ اس نے آلات کو جو معاشرے کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تھے، دیوتا بنا دیا جن کی پوجا ہونے لگی۔ اس کی وجہ سے غیر معمولی مادی ایجادات اور اقتصادی پیداوار میں اضافہ ہوا لیکن اس نے ثقافتوں کی رنگا رنگی کو برباد کر دیا جس میں انسان روایتی طور پر زندہ رہتا ہے اور جس میں ان کی زندگیوں کو کوئی مفہوم ملا۔ ترقی اور فروغ، استحکام اور قناعت کے لیے گماشتے بن گئے۔ جنہیں وہ رکاوٹیں سمجھا گیا جو انسانی تخلیق کی آزادانہ ترقی کو روکتی ہیں۔

''آپ روشن خیالی کی فکر کامیابیوں کو مسترد کرتے ہیں؟''

میں اس کی ترجیحات کو مسترد کرتا ہوں۔ اس کے تمام پھل کو نہیں۔

''کیا سائنس کی جستجو کو روکا جانا چاہیئے؟''

اخلاقی رویوں کے بارے میں معاشرے کا جو نقطہ نظر ہے۔ اس کے مطابق سائنسی تجربات ضرور کیے جانے چاہئیں۔ سائنس کو اپنا سفر معاشرے کی سماجی ضرورتوں سے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آزاد ہو کر جاری نہیں رکھنا چاہئے۔ سائنس کے پاس کوئی بہت بڑی دانش نہیں ہے بلکہ یہ اس خاص علم کو جمع کرتی اور ہوشیاری کے ساتھ اس کا تجزیہ کرتی ہے جو اسے مہارت اور شعور مہیا کرتا ہے۔ اس کی سوچ عمومی فہم و ادراک پر نہیں ہوتی۔ سائنس بہت زیادہ طاقتور، بہت زیادہ مفید ہے اور انسان کے لیے سود مند ہو سکتی ہے۔ چونکہ یہ مسائل حل کرتی ہے، اس لئے کئی دوسرے مسائل پیدا بھی کرتی ہے۔ سائنس کی کامیابی متوقع اور غیر متوقع دونوں نتائج پیدا کرتی ہے اور موخر الذکر اکثر اوقات اول الذکر کی نسبت زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔

دیکارت کے خیالات کے برعکس سائنس کو اخلاقیات یا روحانیت سے علیحدہ نہیں ہونا چاہئے۔ بیکن کے برخلاف حقائق کی ایک اخلاقی اہمیت ہوتی ہے۔ سائنس کو معاشرے کی خدمت کرنی چاہئے اور اس کا حصہ ہونا چاہئے۔ یہ ایک آلہ ہے اور اسے عقل مندی کے ساتھ استعمال کیا جانا چاہئے کہ دنیا بھر کے معاشروں کو استحکام ملے، ان میں قناعت پسندی اور خوشحالی آئے۔

''ٹیکنالوجی، انڈسٹری اور اقتصادیات کے بارے میں کیا خیال ہے؟
ہم ان کو کیسے استعمال کریں؟''

یہ تمام مفید اور کارآمد وسیلے ہیں لیکن یہ وسیلے اگر بنیادی اقدار کے ذریعے بے قابو رہے تو پھر سماجی استحکام کی تباہ اور ہماری تہذیب کو ہڑپ کر سکتے ہیں۔ اس گفتگو کے دوران، ٹیکنالوجی کے بے قابو ہونے کی دو عملی مثالیں میں نے دی ہیں، ان میں سے ایک مثال ایٹمی توانائی کی اور دوسری مثال تمام وسائل کے استعمال سے زراعت کی ہے۔ میں نے کارآمد اور قائم رہنے والے متبادل بھی گوش گزار کیے ہیں۔ بہرحال ٹیکنالوجی، انڈسٹری، اقتصادیات اور سائنس کو معاشرے کی صحیح ضروریات پوری کرنی چاہئیں ہمیں اپنے وسیلوں کی مزید بہتری کی خاطر استحکام اور قناعت پسندی کی قربانی نہیں دینی چاہئے۔

''کیا آپ حکومت کے کنٹرول سے آزاد اقتصادی نظام پر یقین رکھتے ہیں؟''

جی ہاں۔ اس کی شکلیں ہر معاشرے میں مختلف ہوں گی اور اس کو وہاں کی روایات کے مطابق ہونا چاہئے لیکن یہ نظام چار مغربی معاشروں کے لیے اطمینان بخش نظام ہے۔ آزاد معیشت دراصل سوشلسٹ اور کمیونسٹ مرکزیت کا تریاق ہے۔ یہ ایک موثر اقتصادی نظام کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ نظام ایک خاص نوعیت کے معاشرے سے بندھا ہوا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ اس کی بنیاد ریاستی اختیارات کو محدود کرنے، قانون کی بالادستی، اقتصادی اور سماجی عدم مرکزیت اور آزاد اندرونی مارکیٹوں پر رکھی جانی چاہئے۔ آزاد نظام معیشت اس صورت میں بہتر کام کرتا ہے، جب خاندان اور شہری خود کفیل ہوں اور اپنی زندگیوں کی ذمہ داریاں خود اٹھا سکتے ہوں۔ اس کو ریاستی مرکزیت کے الٹ ہونا چاہیے، اس لیے جہاں ریاستی مرکزیت ہوتی ہے وہاں دوسروں پر انحصار کا کلچر جنم لیتا ہے جو لوگوں کے ارادے اور عزم کو کمزور کر دیتا ہے۔ آزاد اقتصادی نظام کی یہ اخلاقی اور عملی وجہ ہے۔

دنیا تبدیل ہو چکی ہے۔ مارکسٹ مرکزیت پسندی غیر معتبر ہو چکی ہے۔ معاشروں نے اپنی توجہ سرد جنگ سے ہٹا لی ہے اور اب انہیں مختلف خطرات کا سامنا کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ واتسلاف ہیول لکھتے ہیں:

''کمیونزم کا زوال ایک ایسا اشارہ ہے جو بتاتا ہے کہ جدید تصور بحران کی انتہا تک پہنچ چکا ہے۔ عصر حاضر نے پہلی عالمی ٹیکنیکل تہذیب کو جنم دیا لیکن یہ اپنی طاقت کی آخری حد کو پہنچ چکی ہے۔ وہ حد جس کے تحت الثریٰ شروع ہوتی ہے۔ دنیا کے بارے میں انسان کا رویہ تبدیل ہونا چاہئے۔ ہمیں اس عقیدے کو خیر باد کہنا ہوگا کہ دنیا ایک ایسا معمہ ہے جس کا حل ہمیں تلاش کرنا ہے، یا ایک ایسی مشین ہے جس کے ساتھ استعمال کی ہدایات لگی ہیں جنہیں تلاش کرنا ہے، یا یہ کہ ایک ایسا معلوماتی وجود ہے جو کمپیوٹر میں ڈالنا ہے، اس امید کے ساتھ کہ جلد یا بدیر یہ ایک کائناتی حل مہیا کرے گا۔''

ہم میں سے ان لوگوں کو جو آزاد نظام معیشت پر یقین رکھتے ہیں، یہ جاننا چاہئے کہ اگرچہ بہت سی قوموں میں اور بہت سے طریقوں کے ذریعے ہمارے عقیدے معتبر رہتے ہیں لیکن بذات خود ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ انہیں زمینی سطح اور انسانی معاشروں کے طاقتور عمل کے ساتھ جڑا ہوا ہونا چاہئے۔ مارکیٹ فورسز کو مستحکم معاشروں کی ضروریات کے ہم آہنگ بنایا جانا چاہئے۔ وگرنہ مارکسٹوں کی طرح ہمیں بھی ماضی کے میکانکی تبرکات یا میکانکی آثار کی طرح مسترد کر دیا جائے گا۔

''آپ نے کہا کہ پہلے سائنس اور ٹیکنالوجی رکاوٹوں کے بغیر آزادانہ طور پر سفر کر رہی تھیں۔ اب آپ کیا تجویز کرتے ہیں؟''

یہ صحیح بنیادی سوال ہے۔ ان جدید دیوتاؤں کو آپ ڈسپلن میں کیسے لاتے ہیں؟ یہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ یہ اپنے سے بڑی کسی شے کے غلام ہیں۔ سینٹ ٹامس ایکوئناس نے بتایا ہے کہ عقل کو روحانیت کے ماتحت ہونا چاہیے۔ دوسرے اپنے مذہبی روایات کے مطابق ''مقدس''یا'' معاشرے کی ضروریات''یا'' فطرت کے لیے احترام جیسے مختلف الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی الگ تعریف تلاش کرنی چاہیے لیکن تمام انسانی معاشرے کو روحانی ذمہ داری یا پابندی کی ضرورت ہوتی ہے جس کے بغیر انسانی معاشرے گنتی والی مشینوں کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

جدید مغربی انسان کے اضطراب کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں توریت کے پہلے باب کی کہانی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔''سو اللہ نے انسان کو اپنے عکس کے مطابق تخلیق کیا۔ اور اللہ نے کہا'' زمین کو پھل آور بناؤ، زمین کو بڑھاؤ، اسے معمور کردو اور اسے قابو کرو اور سمندر کی مچھلیوں پر، ہوا میں اڑتی ہوئی چڑیوں پر اور زمین پر حرکت کرنے والی ہر جاندار چیز پر اپنی حکمرانی قائم کرو۔''

چند عیسائی ماہرین مذہب ان لفظوں کی تشریحات پر دوبارہ غور کررہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ لفظ بادشاہت یا حکمرانی لفظ تسلط کے مساوی نہیں ہے اور یہ کہ انجیل انسان سے بھی کہتی ہے کہ وہ زمین پر کاشتکاری کرے اور اس کا خیال کرے۔ درحقیقت انسان کو فطرت کی داروغ گی کی ذمہ داری دی گئی ہے۔ عیسائیت کا یہ نقطہ نظر حضرت نوحؑ کی کشتی کی کہانی سے اور مضبوط ہوجاتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو حکم دیا کہ ہر نسل کے دو جاندار بچالو۔ اس کا مطلب لیا جاتا ہے کہ اللہ کی یہ مرضی ہے کہ ہم رنگا رنگی کا احترام کریں اور اسے تحفظ دیں۔

اللہ کا عہد ہر جاندار رشتے کے ساتھ ہوا۔ جس سے صرف انسانی زندگی ہی نہیں بلکہ تمام جانداروں کے تقدس کی تصدیق ہوتی ہے۔ توریت کی کتاب پیدائش میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو تخلیق کرنے کے بعد اس کے ''بڑی اچھی'' ہونے کا اعلان کیا۔ یہ توضیحات سائنس اور متبرک مخلوق کے درمیان وحدت کو دوبارہ تخلیق کرتی ہیں۔ زمین ''بڑی اچھی ہے'' اس لیے کوئی بھی عیسائی اسے کس طرح پامال کرنے کی اجازت دے سکتا ہے۔ انسان داروغہ ہے اور اس حیثیت میں وہ فطرت کا ذمہ دار ہے۔ اس لیے بغیر رکاوٹ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے سفر کرنے کی بجائے، انسان کی تخلیق کردہ سائنس کو اخلاقی، تہذیبی اور سماجی ضروریات کے بارے میں حساس ہونا چاہیے۔

عیسائی فلسفی ڈاکٹر زینے دوبو نے کہا کہ ''ہمیں انجیل کی تعلیم کو اپنے دلوں میں بسانا چاہئے۔ رب العزت نے انسان کو باغ عدن میں بھیجا تا کہ وہ اسے ٹھیک کرے، اس کی نگہداشت کرے۔ اس کا مطلب صرف یہ نہیں کہ زمین ہمیں ہماری خوشیوں کے لیے دی گئی ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ یہ ہماری نگہداشت میں دی گئی ہے۔ ایسے معاشروں نے جہاں ٹیکنالوجی عروج پر ہے، زمین کا خاصا استحصال کیا ہے۔ ہمیں اس رویہ کو الٹانا ہوگا اور محبت کے ساتھ زمین کی نگہداشت کے بارے میں جاننا ہوگا۔''

چند لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سے بھی آگے جانا چاہیے۔ ان توضیحات میں انسان جو نگہبان ہے، فطرت سے الگ رہتا ہے اور باقی تمام جاندار اشیاء سے برتر ہے۔ وہی اور صرف وہی اللہ کے عکس میں تخلیق کیا گیا ہے۔ یہودیت وعیسائیت کے تصور کی سب سے اہم لڑی سینٹ فرانسس آف ایسیسی تھے، جو صرف انسان ہی کو نہیں بلکہ پوری فطرت کو خدا کا آئینہ سمجھتے تھے اور تمام مخلوق کو اپنے بھائی اور بہنیں کہتے تھے۔ ''کرانیکل آف دی ایجز'' میں وہ بھائی سورج، ہوا، آگ اور بہن چاند، پانی اور ماں زمین کے بارے میں بات کرتے ہیں لیکن ان کے تصورات کو جلد ہی فراموش کر دیا گیا یہاں تک کہ خود فرانسیئن تحریک نے اسے بھلا دیا اس لیے کہ اس وقت چرچ یورپ کے علاقائی مذاہب کو دبانے کی جدوجہد کر رہا تھا جو یہ کہتے تھے کہ انسان کا فرض ہے کہ وہ فطرت کی تعظیم کرے۔

> ''اللہ کے احکام کہ ''زمین کو ثمر بار کرو، اسے بڑھاؤ اور اس کی تعظیم کرو'' کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔''

''لائف آن ارتھ'' میں ڈیوڈ ٹین بورو کہتے ہیں کہ زندگی کی مثال اس طرح ہے جیسے وہ ایک سال کے عرصے میں وجود میں آئی۔ اس عرصے کے مطابق اگر ارتقاء یکم جنوری کو شروع ہوا تو 31 دسمبر تک انسان زمین پر ظاہر نہیں ہوئے۔ تقریباً اپنی تمام عمر میں انسان کے بغیر قائم رہی۔ پہلے سن عیسوی سے اٹھارہ سو سال کے دوران صنعتی انقلاب کے ظہور پذیر ہونے تک انسانی آبادی 250 ملین سے بڑھ کر 900 ملین ہوگئی۔ 1800ء سے 1992ء تک یہ 5.5 بلین ہوگئی۔ 2050ء تک یہ 9.6 بلین تک پہنچ جائے گی۔ غور طلب بات یہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے کہ جس شرح رفتار سے انسانی آبادی بڑھ رہی ہے اسی شرح سے دوسری جاندار چیزیں ختم ہو رہی ہیں۔

مزید برآں ہم نے دنیا کی آبادیوں کو اکھاڑ کر مسائل کو گمبھیر کر دیا ہے۔ بجائے اس کی کہ خاندانی یونٹوں کو اپنے اپنے مستحکم گروہوں میں ہی رہنے دیتے تاکہ وہ اپنے آباؤ کے کلچر سے جڑے رہتے اور اپنی روایات کے مطابق زندگی گزارتے ہم نے خاندانوں، ثقافتوں اور روایات کو تباہ کر دیا ہے اور اس عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ آبادیوں میں زبردست اضافہ ہوا ہے بلکہ وہ بکھرا کر اشتراکی عمل سے الگ ہو گئی ہیں۔

کیا انسان، نگہبان کے کردار میں، جو فطرت کا ذمہ دار ہے، انسانی آبادی کی مطابقت سے اپنی ذمہ داری پوری کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں کیا وہ فطری ماحول کو قائم رکھنے کی اجازت دے گا؟ یا انسان ناکام ہو جائے گا اور فطرت پر چھوڑ دے گا کہ وہ مناسب توازن بحال کرے جیسا کہ ماضی میں ہوتا رہا ہے کہ جب آبادی میں اضافہ ہوتا تھا تو انسانی تباہی ظہور پذیر ہوتی تھی؟

> ''توریت کی کتاب پیدائش کی کہانی میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں ان میں اور دوسرے بڑے مذاہب کے اعتقادات میں کیا فرق ہے؟''

پرانے چینیوں کا خیال تھا کہ انسان پانکو کے جسم پر بیٹھے ہوئے پسوؤں سے تخلیق کیا گیا تھا۔ پان کو، ان کے نزدیک، پہلا متنفس تھا جس کی موت اور اعضا کے الگ الگ ہونے سے دنیا بنائی گئی۔ آرتھر کوٹریل اور یونگ پیپ نے کہا کہ ''مغربی لوگوں کے لیے سب سے اہم بات وہ عاجزانہ حیثیت ہے جو چینیوں نے انسان کے ساتھ منسوب کی۔ انسان کو نہ تو تخلیق کا مرکز بنایا نہ ہی اسے دیو دکھایا بلکہ اسے فطری اشیاء کے بہت بڑے بہاؤ میں ایک چھوٹا سا ہندسہ ظاہر کیا۔

بدھ مت اور ہندو مت میں نسل انسانی اور دوسری جاندار مخلوق میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ ان سب کے لیے یکساں قوانین ہیں اور ان سب کا مقدر ایک سا ہے۔ بودھ دیو مالا میں انسان کی مرکزی حیثیت نہ ہونے کی اہم مثال الیگزینڈر ایڈ ڈیوڈ نیل کی کتاب ''بودھ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مت: اس کے اعتقادات اور طریقے'' میں ملتی ہے۔

''ایک نوجوان شہزادہ، جس کو تاریخ میں بدھ کہا گیا ہے، اپنی کسی پہلی زندگی میں ایک جنگل میں سے گزر رہا ہے۔ غیر معمولی خشک سالی نے چشموں کو خشک کر دیا ہے۔ دریاؤں میں ریت اور پتھر رہ گئے ہیں۔ سورج کی تپش سے مرجھائے ہوئے پتے گر چکے ہیں اور جانور کہیں اور ہجرت کر گئے ہیں۔ اس اجاڑ بیابان میں شہزادے نے اپنے قریب ہی جھاڑی میں بھوک سے مرتی ہوئی ایک شیرنی دیکھی جس کے پاس اس کا بچہ بھی ہے۔ شیرنی نے بھی شہزادے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آئی اور لگتا تھا کہ اپنے شکار پر جھپٹنا چاہتی ہے۔ لیکن کمزوری کے باعث اس میں اٹھنے کی اور شہزادے پر حملہ کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ وہ اسی طرح پڑی رہتی ہے۔ اسے دکھ ہے کہ وہ اپنے بچے کو دودھ نہیں پلا سکتی۔ اس کی حالت قابل رحم ہے۔ تب وہ نوجوان شہزادہ اپنے راستے سے مڑتا ہے، شیرنی کے پاس جاتا ہے جو اس کے پاس نہیں پہنچ سکتی اور اپنے آپ کو خوراک کے طور پر پیش کرتا ہے۔''

اس کہانی کی اہمیت اس کا مغربی قصوں سے قطعی طور پر مختلف ہونا ہے۔ یہ اختتام خوش کن نہیں ہے۔ شہزادے کو آخری لمحہ میں بچایا نہیں جاتا اور مغربی روایت میں زندہ رہنے والے ہم لوگوں کے لیے اس کی قربانی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

مغرب میں فطری اور فوق الفطری، حدود کے درمیان جو فرق مانا جاتا ہے۔ وہ جاپانی عقیدے مشتد میں نہیں ہے۔ فطرت کو خدا کا ٹھکانہ سمجھا جاتا ہے، الوہیت کا مقام گردانا جاتا ہے۔ چین کے مقامی مذہب تاؤ ازم میں انسان کو دوسری مخلوقات پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ فطرت پر انسان کی مرضی ٹھونسنے کو نہیں بلکہ فطری عمل کے ساتھ ہم آہنگی ہی کو دنیا کے ساتھ آدمی کا صحیح تعلق تسلیم کیا جاتا ہے۔

''ابتدائی لوگوں کے مذہبی عقائد کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''

نقطہ ہائے نظر میں فرق کو واضح کرنے کا بہترین طریقہ شاید یہ ہے کہ اس خط کے اقتباسات پیش کیے جائیں (غلط یا صحیح، اس کی کوئی اہمیت نہیں) جو امریکن انڈین قبائل ڈوامش، سکوامش کے چیف سیٹل سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ظاہراً خط منشی کی مدد سے لکھا گیا ہے اور یہ 1854ء میں صدر فرینکلن پیئرس کو امریکی حکومت کی درخواست کے جواب میں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھیجا گیا تھا جس میں ان قبائل کی زمینیں حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی گئی تھی۔

''آپ آسمان کو، زمین کی گرمی، اس کے تپاک کو کیسے خرید یا بیچ سکتے ہیں؟

ہمارے لیے یہ تصور ہی عجیب وغریب ہے۔ اگر ہم ہوا کی تازگی اور پانی کے چمک کے مالک نہیں ہیں تو آپ انہیں کیسے خرید سکتے ہیں؟ اس زمین کا ہر حصہ میرے لوگوں کے لیے مقدس ہے۔''

چمکتے ہوئے صنوبر کی ہر نوک دار شاخ، ہر ریتلا ساحل، جنگلوں میں پھیلی ہوئی تمام دھند اور ہر سانس لیتا ہوا کیڑا، میرے لوگوں کے یادداشت اور تجربے کا حصہ اور مقدس ہے۔ درختوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی کھائیاں میرے لوگوں کی یادوں سے اٹی پڑی ہیں۔

سفید فاموں کے مرے ہوئے لوگ اپنی موت کے بعد اپنی مادر وطن کو بھول جاتے ہیں۔لیکن ہمارے لوگ مرنے کے بعد بھی اپنی خوبصورت زمین کو کبھی نہیں بھولتے۔ اس لیے کہ یہ ریڈ مین کی ماں ہے۔''

ہم زمین کا حصہ ہیں اور زمین ہمارا حصہ ہے۔ خوشبو سے مہکتے ہوئے پھول ہماری بہنیں ہیں۔ ہرن، گھوڑا، باز، یہ سب ہمارے بھائی ہیں۔ پہاڑی چوٹیاں، سبزہ زاروں کے رس، ٹٹو اور انسان کے جسم کی حرارت۔ یہ سب کچھ ایک ہی خاندان سے متعلق رکھتے ہیں۔

یہ چمکتا ہوا پانی جو ندیوں اور دریاؤں کی طرف جاتا ہے محض پانی نہیں بلکہ ہمارے آباؤ کا لہو ہے۔ دریا ہمارے بھائی ہیں۔ یہ ہماری پیاس بجھاتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ سفید فام آدمی ہمارے طریقوں کو نہیں سمجھتا۔ اس کے لیے زمین کا ایک حصہ اسی طرح کا ہے جس طرح کا دوسرا حصہ ہے۔ اس لیے کہ وہ اجنبی ہے جو رات کو آتا ہے اور جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے زمین سے چھین لے جاتا ہے۔ زمین اس کا بھائی نہیں بلکہ دشمن ہے اور جب وہ اسے فتح کر لیتا ہے تو آگے بڑھ جاتا ہے۔ وہ اپنے پیچھے اپنے باپ کی قبریں چھوڑ جاتا ہے اور پروا نہیں کرتا۔

وہ اپنے باپ کی قبر اور اپنے بچوں کے حق پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ وہ اپنی دھرتی ماں، اپنے بھائی آسمان کے ساتھ انہی چیزوں جیسا سلوک کرتا ہے جو خریدی جاتی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں، لوٹی جاتی ہیں، بھیڑ بکریوں یا چمکتے ہوئے موتیوں کی طرح فروخت کی جاتی ہیں۔ اس کی ہوس زمین کو بانجھ کر دے گی اور پیچھے ایک لق و دق صحرا رہ جائے گا۔

چوپایوں کے بغیر انسان کیا ہے؟ اگر تمام چوپائے چلے جائیں تو انسان روحانی تنہائی سے مر جائے گا۔ اس لیے کہ جو کچھ چوپایوں کے ساتھ ہوتا ہے جلد ہی انسانوں کے ساتھ بھی ویسا ہی ہوتا ہے۔ تمام چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔

جو کچھ زمین پر گزرتی ہے، وہی کچھ زمین کے بیٹوں پر گزرتی ہے۔ آدمی نے زندگی کا جالا نہیں بنا بلکہ وہ تو اس میں صرف جکڑا ہوا ہے۔ وہ جو کچھ جالے کے ساتھ کرتا ہے درحقیقت اپنے ساتھ کرتا ہے۔"

☆☆☆

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com